آفتابِ دمشق

یہ دِل آویز تاریخی ناول دورِ جدید کے دردنگار علامہ راشد الخیری دہلوی ایڈیٹر عصمت کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اس میں تثلیث و توحید کی آویزش صلیب و ہلال کے مقابلے۔ اسلام و نصرانیت کے معرکے والے دمشق کیلوث کی خورشید لقا لڑکی "سلونیہ" کے حُسن و عشق کے دلگداز افسانے اس کی اسلامی خدمات عصمی ادا الہری قیصر رُوم کی عبرتناک شکست کا نقشہ نہایت دلربا پیرایہ میں کھینچا گیا ہے۔ علامہ راشد الخیری کا نام نامی آنے کے بعد کسی تصنیف کی عمدگی و نفاست کے ثبوت پر دلیل لانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ علامہ موصوف کی غم نگاری سنگدل سے سنگدل انسان کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کا خراج وصول کر لیتی ہے۔

حجم تقریباً ۱۵۰ صفحات قیمت بالکل معمولی صرف ایک روپیہ عہ

منیجر مخزن لاہور

قاضی انوار حسین - اس کا سبب؟

میرزا فرحت - اس کا سبب یہ ہے کہ سید اصغر علی کے خاندان اور ان کے چال چلن سے حافظ صاحب واقف ہیں۔ دونوں صاحبوں کی اصلیت شہر دہلی کی ہے۔ ان کی طرف سے پورا اطمینان ہے۔ اور آپ سے نہ اگلی شناسائی، نہ آپ صاحبوں کی طرزِ معاشرت سے آگاہی۔ نہ آپ شاہجہان آباد کے رہنے والے۔ اس لئے احتیاطاً کابین نامہ لکھوایا جائیگا۔

قاضی انوار حسین - میرزا صاحب! ہمارے خاندان میں آج تک کسی نے کابین نامہ نہیں لکھا ہے۔ اس واسطے ہم نئی بات نہیں کر سکتے۔ اور نہ ہمارے ہاں شہر کے باہر کابین نامہ کا رواج۔

میرزا فرحت - اے جناب ہم کو باہر شہر اور آپ کے رواج خاندان سے کیا غرض۔ ہم کو اپنے خاندان اور اپنے مطلب سے مطلب ہے۔ آپکو کابین نامہ ضرور لکھنا ہوگا۔

قاضی انوار حسین - میرزا صاحب! میں اس سے زیادہ گفتگو کرنی نہیں چاہتا۔ آپ حافظ صاحب سے جاکر صاف کہہ دیجئے کہ دولہا اور دولہا کے بھائی کو یہ شرط منظور نہیں ہے۔ نکاح ہو یا نہ ہو۔

میرزا فرحت دہلی کے شہزادے اور نازک مزاج - ان کو قاضی انوار حسین کی یہ باتیں بہت ناگوار ہوئیں۔ اور انہوں نے دوسرے کمرے میں جاکر حافظ احمد علی سے کہا۔ حافظ صاحب قاضی جی کی نیت درست نہیں ہے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ میرے بھائی کا نکاح ہو یا نہ ہو میں کابین نامہ نہیں لکھ سکتا۔ حافظ جی شریف اور شریف بھی بے حد۔ میرزا فرحت کی باتیں سن کر دم بخود ہوگئے اور چپکے زنانہ ڈیوڑھی پر چلے گئے۔ وہاں سمدھنوں کی خاطر مدارات ہو رہی تھی۔ اور عورتیں دونوں لڑکیوں کو دلہن بنانے میں مشغول تھیں۔ مارے غل کے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ جب بہت چیخے چلائے تو وزیرن ماما ڈیوڑھی تک آئی۔ اور اس نے کہا میاں آپ کیا فرماتے ہیں۔ ہم کو تو دم لینے کی فرصت نہیں ہے۔ ادھر تو سمدھنوں کی آؤ تواضع میں لگ رہی ہیں۔ اُدھر خدا رکھے دونوں لڑکیاں۔ انہیں دلھن

بنا رہی ہیں۔

[illegible] صاحب۔ خیر تم اپنی بیوی کو تو میرے پاس بلا لاؤ۔ مجھے ان سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔

وزیرن دوڑی دوڑی حویلی میں گئی۔ اور حافظ احمد علی صاحب کی بیوی کو ڈیوڑھی میں بُلا لائی۔

حافظ صاحب کی بیوی۔ کہو صاحب کیا کہتے ہو؟ جلدی کہو۔ ابھی سمدھنوں کو شربت پلانے کا بھی وار نہیں آیا۔ ایک جان [illegible] کام ہیں۔ جہیز کے جوڑوں میں سے ایک جوڑا ابھی نہیں ٹکا ہے۔ جہاں آرا بیگم اور ہرمزی [illegible] بیٹھی [illegible] پرو رہی ہیں۔ چنبا اور دکران صندوقچے میں سے نکال [illegible] رہی تھی [illegible] ڈیوڑھی پر کھڑے چلا رہے ہیں۔ اور آپ کو بُلا رہے ہیں۔ جلدی چلئے۔

حافظ صاحب۔ کیا کہوں [illegible] کاغذ لکھنے کی حامی نہیں بھرتے اور کہتے ہیں چاہے نکاح ہو یا نہ ہو ہم کاغذ نہیں لکھنے کے۔

حافظ جی کی بیوی۔ (سر پکڑ کر) اے [illegible] تو بری کو ہی دیکھ کر [illegible] یہ لوگ کم ہمت ہیں۔ مصری کھانڈ۔ نقل میلے۔ قرص خراب۔ کلا و دیے بے رونق۔ تنبو گھن کھایا ہوا۔ سہاگ پوڑہ کوئی [illegible] سوا روپیہ والا۔ مہندی اتری ہوئی۔ جوڑے [illegible] دیکھے سے تن بدن میں آگ لگی جاتی ہے۔ اب تم نے یہ اور سنایا کہ کاغذ لکھنے سے انکار کرتے ہیں۔ تو ان سے کہہ دو۔ جائیے اپنا رستہ لیجئے۔ تمہارے کورے چاول تمہارے ہاں۔ اور ہمارے کورے چاول ہمارے ہاں۔ بھاڑ میں جائیں چولھے میں جائیں۔ خدا ان [illegible] سے بچائے۔ موئے [illegible] گنوار گوں کے یار۔ وہی مثل ہے "چمڑی جائے پر دمڑی نہ جائے۔" تم ان سے جا کر صاف کہہ دو کہ تمہیں کاغذ لکھنا منظور نہیں۔ ہمیں لڑکی کا نکاح کرنا منظور نہیں۔ [illegible] اللہ کا نام [illegible] کا نکاح پڑھوا [illegible] کہیں [illegible] چھوٹی کا کر دیا اور بڑی کو بٹھائے رکھا۔ خیر کہیں [illegible] اپنی اپنی تقدیر۔

حافظ احمد علی اپنی بیوی [illegible] باہر آئے۔ اور میرزا فرحت۔ مولوی عبد الرحمن۔

میرزا یا ... نے بجز اپنے دوستوں اور عزیزوں سے کہا کہ لڑکی کی ماں کی بھی یہی مرضی ہے کہ یا تو کاغذ لکھوا لیا جائے۔ نہیں قاضی جی والی برات کو اٹھا دیا جائے۔ مردوں نے بھی متفق ہو کر حافظ صاحب کی بیوی کے قول کی تصدیق کی۔ اور قاضی انوار حسین سے جاکر کہا کہ اگر آپ کا بھائی پانچ ہزار کا مہر قبول کر سکتا ہے۔ اور کاغذ پر لکھ سکتا ہے تو نکاح ہو سکتا ہے نہیں بخیر و شما بسلامت۔ اپنے دولت خانے کو ٹھنڈے ٹھنڈے تشریف لے جائیے۔ کیونکہ اس حجت و تکرار میں بہت دیر ہو گئی ہے۔ دوسری لڑکی کے نکاح کا حرج ہو رہا ہے۔ مگر بقول شخصے مرغ کی ایک ٹانگ۔ قاضی جی یہی کہتے رہے ہم کاغذ نہیں لکھ سکتے ہیں۔ اور نالایق اُن کے منہ سے یہ بھی نکلا کہ ہم بغیر نکاح کئے ہٹنے والے بھی نہیں۔ بیٹی والوں کو یہ فقرہ ان کا بہت ناگوار گزرا۔ اور وہ اس کا جواب سخت دینا چاہتے تھے۔ لیکن حافظ جی کے بڑے صاحبزادے کو جس کا نام رفیع تھا۔ اس کے سننے کی تاب نہ ہوئی اور اسے طیش آگیا۔ اور اس نے ایک کی نہ دو قاضی خورشید حسین یعنی دولہا کو مسند پر سے گھسیٹ کر چاندنی پر کھڑا کر دیا۔ اور کہا خیر اسی میں ہے کہ آپ یہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جائیے نہیں تو بہت بگڑے گی وقت بہت دگرگوں ہوگا۔ اور قاضی انوار حسین سے کہا شعر

پگڑی اپنی سنبھالئے گا میر ۔ اور بستی نہیں یہ دلی ہے

اگرچہ یہ موقع ایسا تھا کہ ایک ادنیٰ اور کمینہ آدمی کو بھی غصہ آجاتا اور وہ رفیع سے ضرور گتھم گتھا ہو جاتا۔ مگر خورشید حسین نے اُف نہیں کی۔ خدا جانے اُس کا مزاج ہی ایسا حلیم تھا یا موقع اور وقت کا لحاظ اس نے کیا۔ دولہا کو دھکیل دینا اور براتیوں کو دھکے دے دینا تھوڑی بات نہ تھی۔ اس لئے ساری محفل درہم برہم ہو گئی۔ اور کوٹھی میں ہلچل مچ گیا۔ تو مجھ پر اور میں تجھ پر۔ اسی ہنگامے میں دولہا نے اپنے بھائی انوار حسین سے کہا کہ پرائے شہر میں آکر آپ کیوں رسوا ہوتے ہیں۔ اور اپنے ساتھ مجھے کیوں بلا میں پھنساتے ہیں۔ وہ لوگ کیا بیجا کہتے ہیں۔ کابین نامے کیا نہیں لکھے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے مہر نہیں ہوتے ہیں۔ مگر خدا جانے اس وقت آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ رفیع کے دھمکانے اور بھائی کے اس کہنے سے قاضی صاحب کی عقل ٹھکانے ہوئی اور انہوں نے بقول ؎

آنچہ دانا کند کند ناداں لیک بعد از ہزار رسوائی

میرزا فرحت صاحب سے کہا ہمارا قصور آپ صاحب معاف کریں۔ ہمیں آپ کی دونوں شرطیں بدل و جان منظور ہیں۔ پانچہزار کا مہر بھی بندھوا دیجئے اور کاغذ بھی لکھوا لیجئے۔ بارے اُسی وقت شادی لال قبالہ نویس نے کابین نامہ تحریر کیا۔ دولھا نے اپنے دستخط اور اُن کے بھائی اور سب براتیوں نے گواہی لکھدی۔ مہریں کر دیں۔ اور رامتہ (دلہن کا نام ہے) کا نکاح اس دقت اور پریشانی کے بعد خورشید حسین سے ہوگیا۔ اور چونکہ حافظ صاحب کی چھوٹی لڑکی کے نکاح کے وقت کوئی قضیہ یا قصہ پیش نہیں آیا ہو اسطے اس کی نسبت صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ اس کا نکاح بخیر و خوبی اصغر علی کے ساتھ ہوگیا۔
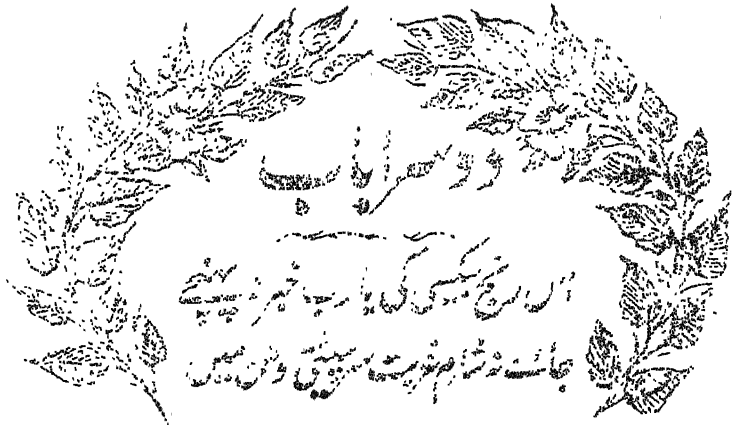
صبح کی دلہن نے شفق کا لال جوڑا پہنا۔ آسمان کے نیلگوں رنگ سے مسّی لگائی۔ اور نور کے زیور سے آراستہ ہوئی۔ ادھر سورج کے دولھا نے اپنے آفتابی چہرہ پر کرنوں کا سہرہ باندھکر فلک کے تخت پر جلوس کیا۔ تمام دنیا میں روشنی پھیل گئی۔ وہاں کے کمپنی باغ میں پیڑ پیڑ اور درخت درخت نے پھول اور پتیوں کی پوشاک اور گہنے سے اپنے تئیں ایسا سجایا کہ گویا ان کو بھی کسی کی برات میں جانا ہے۔ حافظ احمد علی کے زنانہ میں گو مہمانوں اور خانہ کی عورتوں کی وجہ سے رونق اور گہما گہمی ہو رہی ہے۔ مگر چونکہ لڑکیوں کی رخصت کا وقت قریب ہے۔ اس لئے ایک سناٹا چھایا ہوا ہے۔ ماں الگ رو رہی ہے۔ نانی جد...

آنسوؤں سے منہ دھو رہی ہے۔ ایک تو صبح کا جھٹپٹا وقت پھر بچھڑ رہی ہے کہ ڈولیں
ڈومنیوں نے منڈھا گا کے سب کے دل ہلا دیئے۔ لڑکیاں بچیاں بوڑھیاں بڑھیاں
روتی روتی تھکی جاتی ہیں۔۔ دلہنوں کی آنکھیں روتے روتے سوج گئی ہیں۔ دلوں میں
یاس و حسرت چھا رہی ہے۔ اس میں پنیس دروازے پر آگئی۔ رسمیں ہو چکیں۔ دولہا
گھر میں آیا۔ پیچھے ڈولیاں چھپ گئیں۔ دولہا نے دلہن کو گود میں لے پنیس میں بٹھایا۔
آپ گھوڑے پر سوار ہوا۔ آگے آگے دلہن کی پنیس پیچھے پیچھے دولہا کا گھوڑا۔ اس کے
پیچھے براتیوں کی پالکی گاڑیاں سیدھی ریلوے سٹیشن پہنچیں کیونکہ ہم نے آپ کو پہلے
سمجھا دیا ہے کہ یہ لوگ باہر کے رہنے والے ہیں۔ ریل میں سوار ہو کر اپنے وطن کو جائیں گے۔
بات کرتے میں سٹیشن آگیا۔ سواریاں مسافر خانہ کے سامنے تھم گئیں۔ اللہ اکبر! اس سٹیشن
عجیب تماشا ہے۔ دیکھو کس قدر ازدحام ہے۔ مسافر خانہ آدمیوں سے کھچا کھچ بھر رہا ہے۔
کوئی مسافر دری بچھائے بیٹھا ہے۔ سامنے ایک بیگ رکھا ہے۔ ایک شخص اپنی گٹھری پر ہی
بیٹھے بیٹھے ہیں۔ ایک صاحب ٹکٹ لئے بیگ ڈالے ٹہل رہے ہیں اور ہر دفعہ ٹکٹ گھر
کی کھڑکی کو جا کر دیکھ آتے ہیں کہ کھلی یا نہیں۔ سینکڑوں گنوار دھوتی بند اور سینکڑوں
گنواریاں لہنگے پہنے زمین پر پسکڑا مارے بیٹھی ہیں۔ ایک طرف ڈولیاں لگی ہوئی ہیں جن میں
پردہ نشین عورتیں بیٹھی ہیں۔ مگر پردہ کی پھانک میں سے تاک جھانک برابر ہو رہی ہے۔ ایک جانب
ایک مرد ریش جانماز بچھائے بیٹھے ہیں اور وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ اجمیر شریف کے عرس
کا حال بیان کر رہے ہیں۔ ایک سمت مختصر سا فرش بچھا ہوا ہے۔ اور اس پر ایک رنڈی
صاحبہ رونق افروز ہیں۔ ڈھاکہ کی دوپٹہ آب رواں کا چنا ہوا کچھ کمر پر کچھ سینہ پر پڑا ہے
سر بالکل کھلا ہوا ہے۔ کان میں بالیاں تو نہیں ہیں مگر چھلے ضرور پہنے ہوئے ہیں۔ سامنے
حقہ رکھا ہوا ہے۔ اور بڑی نزاکت کے ساتھ نوش فرما رہی ہیں۔ ان کے پہلو میں تین
ڈوم بھی تشریف رکھتے ہیں۔ ایک کنارہ کے پیچھے طبلہ بندھا ہوا دھرا ہے۔ دو دہری
دوہری سارنگیاں تند کے غلاف میں بندھی اسی تکیے سے لگی رکھی ہیں۔ اور اس کے علاوہ
اور اسباب کی گٹھریاں اور بچھونے بستر بندے کسے کسائے بی صاحب کی کمر سے لگے رکھے ہیں۔

سب عورتوں کو بٹھایا۔ آپ جدا ایک کمپارٹمنٹ میں سوار ہوئے۔ چند منٹ کے بعد گاڑی
چلی اور سلیم گڈھ ہوتی ہوئی لوہے کے پل کو طے کرتی ہوئی شاہدرہ پہنچگئی۔ شاہدرے
سے غازی آباد۔ دادری سکندرآباد پر ٹھہری۔ اور وہاں سے چل کر بلند شہر کے سٹیشن پر تھمی۔
قاضی انوار حسین اور شریف حسین اور ان کے ہمراہی فوراً اتر پڑے۔ اور زنانہ گاڑی میں
سے دلہن اور اپنی دونوں بہنوں اور سب عورتوں کو جھٹ پٹ اتار لیا۔ ان چھوٹے سٹیشنوں
پر ڈولی نہیں ملا کرتی۔ اس لئے دلہن بیچاری کو پلیٹ فارم سے سٹیشن کے باہر سڑک تک
جہاں تانگے اور دو پہیہ کھڑے تھے پیدل جانا پڑا۔ الغرض ایک دو پہیہ میں دلہن سوار کیگئی
اور تانگوں میں مرد بیٹھکر روانہ ہوئے۔ آمنہ بیچاری کو اس سے پہلے کبھی دو پہیہ میں بیٹھنے
کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اس لئے اس کو دو پہیہ میں بیٹھکر بڑی تکلیف ہوئی۔ ایک تو نئی نویلی
دلہن شرم کی ماری جھکی بیٹھی تھی۔ اس پر دو پہیہ کی ناہموار بیٹھک۔ وہ کسی طرح اس میں
چین سے نہ بیٹھ سکی۔ چونکہ قصبہ احمد آباد (دلہن کی سسرال کا نام ہے) وہاں سے
تقریباً ۱۰ میل تھا اس لئے راہ میں رات کے ۸ بج گئے۔ اور جنگل ویران میں گیدڑوں
نے گویا بازی اور شام کلیان کی الاپ شروع کر دی۔ اندھیری رات جنگل بیابان اور
سنسان میدان ہوا کا سناٹا گیدڑوں کی بھاؤں بھاؤں سن کر آمنہ کا کلیجہ دہلا جاتا تھا غریب
اور بدنصیب لڑکی دل میں کہتی تھی واہ رے نصیب۔ کہاں پیدا ہوئی کہاں بڑھی پلی اور کہاں
قسمت لائی ہے۔ رات کے ۹ بجے قصبے میں برات پہنچی۔ مکان اتنے تنگ کوچہ میں واقع ہوا تھا
کہ زنانہ دو پہیہ اندر تک نہ پہنچ سکا۔ اور ڈولی قصبے میں تھی ہی نہیں۔ دلہن کو پھر دو پہیے
سے اتار کر پیدل چلایا گیا۔ اور وہ بڑی مشکل سے گلی کی منزل طے کر کے گھر میں داخل ہوئی۔
قاضی جی کی بہن۔ اری کلیا بھلا اس وقت گوشت تو کہاں ملیگا تھوڑے سے چاول
اور دال لے اور کٹھیا میں سے گھی تو نکال لے کھچڑی ہو جائیگا اور منگوچیں منگالے۔
کلیا جولاہی۔ اچھا بیوی پکاتی ہوں۔
آمنہ دلہن اور پھر دلہن بھی وہ دلہن جس کو اپنی سسرال میں آئے چند منٹ گذرے
تھے بول تو کیا سکتی تھی مگر وہ اپنے دل میں کہتی تھی کہ الٰہی کھچڑی کیا چیز ہے اور منگوچیں کس شئے

ہیں۔ اس لئے ان کے دیکھنے سے خفقان ہوتا ہے۔ دیواروں کا نظارہ اس سے
بھی زیادہ وحشت خیز تھا۔ نہ ان پر سفیدی پھیری گئی تھی نہ کھریا۔ سامنے دیوار
میں مٹی کا ایک چراغدان بنایا گیا تھا جو نہایت بدشکل تھا۔ اور توارد روزگار سے
پرانا ہوکر اور چراغ کے بہے ہوئے تیل سے چکنا ہو کر آبنوسی بن گیا تھا اور اس پر خاک
اڑ اڑ کر جم گئی تھی۔ دیوار پردہ کی گر گئی تھی۔ اور چونکہ ادھر جنگل تھا اس لئے کبھی کبھی رات
کو گیدڑ اور کتے ہر روز گھس آتے تھے۔ اور سارے گھر میں اپلے گھیلے پھرا کرتے تھے۔ امۃ
کو اس گھر میں راحت اگر تھی تو اس سبب سے کہ شوہر اس کو دل سے چاہتا تھا۔ اور اس کی
صورت کا پروانہ تھا۔

خورشید حسین کے ماں باپ اس کو چھوٹا سا چھوڑ کر مر گئے تھے۔ اور بڑے بھائی نے
اس کو پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ اس واسطے امۃ کے ساس سسر یا جیٹھ جٹھانی بھی انوار حسین اور
ان کی بیوی تھیں۔ قاضی جی لاولد تھے اس لئے ان کو خورشید حسین کے ساتھ بڑی محبت تھی۔
کسی قدر زمین جائداد ان کے پاس تھی۔ مگر زمانہ کی کشاکش اور تنگی کی وجہ سے اس کو بیچ کر
کھا چکے تھے۔ اب گذر اوقات صرف نوکری پر تھی اور نگ آباد میں مکتب پڑھاتے تھے۔
اور خورشید حسین بیکار گھر بیٹھا رہتا تھا کیونکہ اس نے کسی قدر فارسی پڑھی تھی مگر اردو مڈل
پاس تک نہ تھا۔ اس لئے سرکاری ملازمت سے اس کو بالکل مایوسی تھی۔ خود وہ اور اس کی
بیوی قاضی جی کے محتاج تھے۔ جو کچھ انہوں نے کھلا دیا وہ کھا لیا جو انہوں نے پہنا دیا وہ
پہن لیا۔ ایک تو معاش کی تنگی دوسرے یہ قصبہ ویران اس لئے نازو کی بی ہوئی اتر کر دال کے
سوا نہ گوشت نہ ترکاری کا مزا بھی یاد نہ رہا۔ اور سر میں چنبیلی کے تیل کے بدلے کڑوا
تیل ڈالنے لگی۔ پہلے دن جب کڑوا تیل اس نے ڈالا تو بہت گھبرائی۔ سر میں جلن بھی ہوئی درد
بھی ہوا مگر آخر کار عادت ہو گئی۔ دہلی سے حافظ صاحب کے کئی کئی خط قاضی صاحب کے نام
آئے کہ ہم لڑکی کو لینے آئیں مگر قاضی صاحب نے یہی جواب دیا کہ ابھی بہو کو آئے ہوئے
بھی یہاں کے دن ہوئے ہیں۔ دوسرے ہم غریب آدمی ہیں ایسی جلدی نہ بھیج سکتے ہیں نہ
دہلی سے لا سکتے ہیں۔

تیسرا باب

دل کی کلی نہ تجھ سے کبھی اے صبا کھلی
چنپا کھلی گلاب کھلا موتیا کھلی
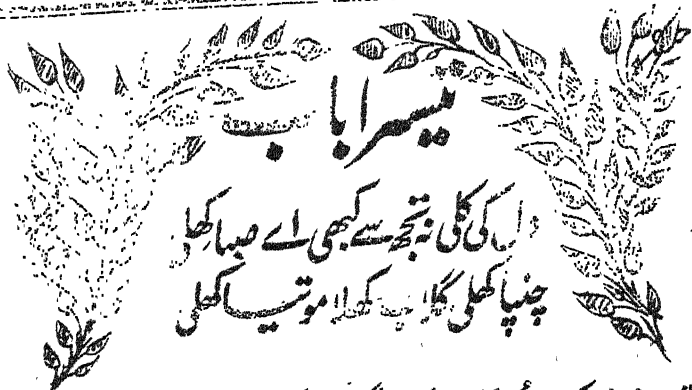
تین مہینے کے بعد اُمتہ کا بھائی قصبے گیا اور اُسے دہلی لے آیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی قاضی جی کی بیوی نے یہ پیغام بھی بھیجا کہ چونکہ اب انشاءاللہ بہو کو کچھ امید ہے اور زچہ خانہ ہمارے گھر ہوگا۔ اس لئے ہم ایک مہینے سے زیادہ نہیں چھوڑ سکتے ہیں۔

امتہ گھر پہنچ گئی۔ ماں۔ باپ۔ بھائی۔ بہن کنبہ والوں سے ملی۔ مگر سسرال کی مصیبت کا اثر اس کے کلیجہ پر ایسا بیٹھ گیا تھا کہ میکے میں آکر بھی اس کے دل کی کلی نہ کھلی۔ اور وہ دن رات اداس کھوئی کھوئی سی پڑی رہتی تھی۔ بہن سہیلیوں ساتھ کی بیاہی ہوئی لڑکیوں نے بہتیری کوششیں کیں اور چاہا کہ امتہ دل کا حال کہے اور جو کچھ سسرال میں گذری ہے وہ بیان کرے مگر اس حیا کی پتلی نے کسی سے کچھ نہ کہا۔ والدین اور بہن بھائیوں نے اس خیال سے کہ کئی مہینے میں باہر سے آئی ہے اور پھر اندر رہنے کی اس کو عادت ہے۔ دنیا کی نعمت اور میٹھی سلونی چیزیں اس کو بازار سے منگوا کر دیں۔ مگر اس خود آگاہ بندی نے خوشی کے ساتھ کچھ منہ پر نہ رکھا۔

ایک مہینے کے بعد خورشید حسین لینے آگئے۔ امتہ کی ماں نے چاہا کہ کچھ دنوں اور ٹھہرائیں مگر امتہ خود نہ ٹھہری۔ اور اس نے اپنی ماں سے کہا کہ سنو بی اماں جان۔ جب انکو بھائی کی بھی خوشی ہے تو ناحق حجت کرنے سے کیا فائدہ۔ ایک مہینے تو ٹھہر گیا۔ اگر دس بیس روز رہ گئی تو پھر بھی جانا ہوگا۔ اب چلی جاؤں گی تو سسرال والوں کا دل خوش ہو جائیگا۔ اور وہ میاں کے ساتھ خوش خوش قصبے چلی گئی۔ مگر قصبے میں پہنچکر معلوم ہوا کہ قاضی جی اور انکی بیوی اور بہنیں اور نند آباد چلی گئی ہیں۔ اور گھر کیا ہے۔ سوائے اس کے اور اس کے میاں کے سوا گھر میں کوئی تیسرا نہ تھا۔

گھر داری کے سارے کام اس کو اپنے ہاتھ سے کرنے پڑے۔ اور خورشید حسین اُمتہ کی سلیقہ کو دیکھکر حیران ہو گیا۔

امتہ اول تو صورت شکل کی اچھی تھی مگر اس کی نیک خصلتیں اور سلیقہ دیکھکر خورشید حسین اس پر سو جان سے فریفتہ ہو گیا اور اس کا دم بھرنے لگا۔ جب آٹھواں مہینہ شروع ہوا تو اپنے میاں سے کہا۔ بھائی جان اور آپا جان اورنگ آباد جا کر ایسے بیٹھے ہیں کہ آنے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ اور میرا اکیلے دم گھبراتا ہے۔ عورت ذات کا دل تو عورتوں سے ہی بہلتا ہے۔ اور اب ان کا گھر پر ہونا بھی ضرور ہے۔

میاں نے کہا تم سچ کہتی ہو مجھے تمہارے بغیر کہے خیال تھا۔ مگر اب تمہارے کہنے سے زیادہ ہو گیا۔ دیکھو میں کل ہی اورنگ آباد جاؤنگا۔ اور بھائی جان اور چھوٹی آپا اور بڑی آپا کو لے آؤنگا۔ خورشید حسین دوسرے دن صبح ہی اورنگ آباد روانہ ہو گیا اور وہاں جاکر اس نے بہن اور بھائی سے کہا کہ آپ کا اب گھر چلنا مناسب ہے اور بھائی سے بھی کہا کہ بیاہ کر کے اور بہنوں کو حیدرآباد بھیج دیجئے۔

قاسمی بی۔ ارے میاں ایسی جلدی کیا ہے کہیں آج دس کے ہاں آٹھ مہینے میں کبھی بچہ پیدا ہوا ہے۔ اور اگر دلی میں اٹھوانسے ہی ہوتے ہوں تو ہمیں خبر نہیں۔ اس کا حال تمہاری گھر والی کو معلوم ہوگا۔ ابھی سے تمہاری بیاہتا چلی جائیں گی تو مجھے بڑی تکلیف ہو جائیگی۔ اس لئے تم گھر کو سدھارو جب دس پانچ دن جننے کے رہیں گے تو میں آپ بھیج دونگا۔ اور بھی خرچ کی جو کہتے ہو میرا حال تم سے چھپا ہوا نہیں ہے وہی کنواں کھودنا اور وہی پانی پینا۔ تنخواہ میں روٹی کا تو کام نہیں چلتا یہ زچہ خانے کا خرچ کہاں سے آئے اور آپ کی بیوی صاحبہ ٹھہریں دلی کی۔ ان کے خرچ کے واسطے تو سو پچاس بھی تھوڑے ہیں۔ مگر خیر تنگ آمد بسخت آمد میں فکر کرونگا۔ اور دس پانچ روپے جو مجھ سے بن پڑیں گے وہ کہیں سے مانگ تانگ کر تم کو دیدونگا۔ مگر اب تمہیں بھی کچھ سوچنا چاہئے۔ جب تک تم اکیلے تھے۔ کچھ بھاری نہ تھے۔ مگر اب خدا کے فضل سے جورو والے ہوئے۔ مہینے ڈیڑھ مہینے میں اولاد والے بھی ہو جاؤگے۔ میرے سر کب تک رہوگے۔ اور میں تمہارے

اور تمہاری بیوی بچوں کی خبر گیری کیونکر کر سکونگا۔ دس بیس کا روزگار نہ ملے تو دو چار ہی کا کر لو مجھ سے اب تمہارا بوجھ نہیں اٹھ سکتا۔

خورشید حسین بھائی کی یہ تقریر سن کر سُن ہو گیا اور اسی روز اورنگ آباد سے پلٹ کر گھر آ گیا۔

اُمتہ (میاں کو پریشان دیکھکر) کیوں خیر تو ہے تمہارا چہرہ اُداس کیوں ہے۔

خورشید حسین۔ کچھ نہیں رستے کی تکان ہے سر میں درد ہو رہا ہے۔

اُمتہ۔ واہ تکان اور سر کا درد اور چیز ہے اور غم اور پریشانی کچھ اور ہوتی ہے۔ تم تو بھائی جان کے پاس سے کچھ رنجیدہ آئے ہو۔

خورشید حسین نے دیکھا کہ عقلمند بیوی نے میری پریشانی کو تاڑ لیا ہے اسلئے ناچار بھائی نے جو کچھ ہوا تھا سب کہا تھا وہ امتہ سے کہدیا۔

اُمتہ۔ بھائی جان نے سچ کہا پھر خود در ماندہ شفاعت کس کی کریں۔ دس روپلی کے نوکر اس پہ ایک آپ ایک بیوی۔ دو بہنیں ایک برابر کا بھانجہ۔ دو ہم تم ایک کا منہ تو کسی طرح بھرا جا سکتا ہے۔ مگر اتنوں کا منہ تو خاک سے بھی نہیں بھرا جا سکتا۔ اللہ نے تمہیں ہاتھ دیئے پاؤں دیئے دشمن اپاہج نہیں پھر گھر میں کیوں پڑے رہو۔ انشاء اللہ پھر چلو کہیں نہ کہیں تو نوکری لگ ہی جائیگی۔

خورشید حسین۔ نوکری ہو گی جب ہو گی خرچ تو آج ہی چاہئیے۔

امتہ۔ تم مرد ہو کر گھبرائے جاتے ہو۔ میں تو عورت ذات ہوں۔ مجھے ذرا فکر نہیں جس نے جان دی ہے وہ نان بھی دیگا اور اس شریف اور نیک بی بی نے میاں کو مغموم دیکھکر ایسی باتیں کیں جس سے خورشید حسین کے ٹوٹے ہوئے دل پر مومیائی لگ گئی۔ اسی اثنا میں کہ قاضی جی کی بیوی اورنگ آباد سے آج آئیں اور کل آئیں امتہ کو نواں مہینہ شروع ہو گیا اور قاضی جی کی بیوی نہ آتی تھیں نہ آئیں۔ بگی ہانڈی کا کیا اعتبار آخر ایک رات کو درد زہ شروع ہو گیا۔ پہلی پلوٹھی کی بات۔ امتہ الفخر بیچاری لڑکی اور پایا اسلئے درد وں کو اس نے بہت ضبط کیا اور چاہا کہ میاں کو خبر نہ ہو مگر بقول سعدی

اور زلفِ عنبرین کی مستانہ خوشبو سے دماغ معطر ہو رہے ہیں۔ اور جو بدنصیب عشاق یاس کے
جدائی کے جال میں مبتلا ہیں۔ اُن کے واسطے بوندیوں کی پھوار تیروں کی بوچھار ہے۔ ایک پرانے
مکان میں جو غمزدوں کے دل کی طرح جابجا سے ٹوٹا ہے خورشید ایک پلنگ کے جھلنگے میں
جدائی اور فراق میں مبتلا پڑا ایسا تڑپ رہا ہے جیسے مچھلی جال میں پھنسکر تلملاتی ہے۔

ساون کی گھٹا پانی برسا رہی ہے تو اس کی آنکھیں خون کی نہریں بہا رہی ہیں۔ رات کی
اس کو کسی کی کالی کالی زلفیں یاد دلاتی ہے اور اسکی چھاتی پر سانپ لوٹ جاتا ہے اور بجلی کی
چمک سے اس کو کسی کے عارضِ تاباں کا خیال بندھ جاتا ہے جو اسکے جگر میں آگ لگا دیتا ہے اور
بے اختیار اس کے منہ سے آہ نکل جاتی ہے۔ جب یہ قرار بیچینی آہ و زاری میں صبح ہو گئی۔ ساون کے
موسلا دھار مینہ نے پتھروں اور پتھر دلوں میں آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔ مگر خورشید کو دل کی لگی نہ بجھی۔
اور دہلی اور اہلِ دہلی کی مقناطیسی جذبِ محبت نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ دل میں کہتا تھا۔ کہ
سسرال کے ٹکڑوں پر جا کر پڑنا بڑی بے غیرتی ہے مگر بقول مومن تھا ع

کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

عشق اور محبت کے سامنے غیرت اور حیا کی ایک نہ چلی اور وہ دہلی پہنچ گیا اور اپنی بیوی اور
پیاری بچی کو دیکھکر باغ باغ ہو گیا اور ہجر کی ساری کلفتیں ایک آن میں دور ہو گئیں۔ ساس
سسر نے اس کی خاطر مدارات میں کمی نہیں کی۔ اور چھ مہینے تک جس طرح ممکن ہوا اپنے
حوصلہ سے بڑھکر اس کی مہمانداری کرتے رہے۔ ان چھ مہینوں میں خورشید حسین کو دہلی کے
تمدن اور معاشرت کی سوسائٹی کی خوبیاں معلوم ہوئیں۔ اور مولانا کے اس شعر کے معنے
اس کی سمجھ میں خوب آ گئے ۔

[illegible] عشق نیست

عقل را [illegible] رونق کند

جامع مسجد کی پنجوقتہ نماز اور خصوصاً جمعہ کی نماز رمضان عید بقرعید کی چہل پہل علماء کی وعظ
و نصیحت کی مجلسیں عرس کے ہنگامے چاوڑی اور چاندنی چوک کی صبح و شام کی سیر مشاعروں کی
دھوم دھام مذہبی جلسے اور مختلف میلے ٹھیلے تفریح اور اہل فن کے عجائبات دیکھکر اسکی عقل دنگ

ہوگئی اور سمجھا کہ دین و دنیا کے مدارج کی ترقی کی یونیورسٹی دہلی ہی ہے۔

حافظ جی نے بہت کوشش کی کہ خورشید حسین کا شہر میں روزگار ہو جائے مگر یہ خدا کا بندہ تقدیر کا ایسا ہیٹا تھا کہ نوکری نہ ملنی تھی نہ ملی۔ اور یہی باعث سے یہ بہت مغموم اور اداس رہنے لگا۔ ایکدن شام کو کمپنی باغ چلا گیا اور ایک بنچ پر بیٹھکر سیر کرنے لگا۔ بہت سے آدمی تو پا پیادہ چل پھر رہے تھے اور گل لالہ و سنبل و نرگس کی انواع و اقسام کی رنگینی اور خوشنما پھولوں کی نزاکت درختوں اور سبزہ کی طراوت دیکھکر خوش ہوتے تھے اور بہت سے گاڑی بگھی ٹمٹم فٹن چرٹ لینڈو میں سوار باغ کی بہار [illegible] ناگاہ خورشید حسین نے دیکھا کہ ایک شخص سرخ و سفید خوبصورت آنکھوں والا اونچی ناک والا جس کی ڈاڑھی زمانہ کے فیشن کے موافق منڈی ہوئی اور مونچھیں بڑی بڑی تھیں۔ انگریزی لباس پہنے ترکی ٹوپی اوڑھے بائسکل پر سوار چلا آتا ہے۔ جسکے نوجوان چہرے سے امارت اور لیاقت دونوں عیاں ہیں حسن اتفاق سے اسکی بائسکل خورشید کے بنچ کے پاس سے نکلی [illegible] خورشید [illegible] دیکھا اور خورشید کے [illegible] دیکھنے سے اس بائسکل سوار [illegible] خورشید کی طرف دیکھا مگر بائسکل چونکہ بہت تیز جا رہی تھی اس واسطے ایک لمحہ میں وہ آگے بڑھ گیا۔ مگر اس بائسکل سوار کے نکل جانے کے بعد خورشید کو خیال آیا کہ یہ صورت باشوکت میں نے کبھی دیکھی ہے مگر حافظے نے اس قدر مدد نہ دی جو اسکے خیال کی تصدیق ہو جاتی۔ اتفاقیہ وہ روش نما سڑک جس کے کنارہ پر بنچ بچھے ہوئے تھے۔ اور خورشید بیٹھا تماشہ دیکھ رہا تھا گول واقع ہوئی تھی اس سبب سے وہ بائسکل سوار اس کے دائرے کو طے [illegible] خورشید حسین خاموش اور متحیر بیٹھا تھا [illegible] کا آمنا سامنا ہو گیا۔ اور [illegible] خورشید حسین کی صورت دیکھکر اسپر کیا اثر پڑا اس نے بائسکل کو روکا اور خورشید حسین سے کہا شاید تمہارا نام خورشید حسین ہے اور تم قاضی شرافت حسین کے بیٹے ہو جو احمد آباد کے [illegible] تھے۔

خورشید حسین [illegible] اس نے کہا کہ [illegible] نام خورشید [illegible] ہے [illegible] نام بھی [illegible] ہی ہے جو آپ نے [illegible] حضور کا اسم مبارک ؟

بائسکل سوار [illegible] نام محمد عظیم [illegible] تمہارے والد

رکھتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ اور دوسرے ان کی واقفیت بھی یہاں والوں سے کم ہے اس لئے
مجھ سے فرمائش ہے کہ آپ کوئی معتمد منشی مجھے تجویز کر دیجئے۔ اب تمہیں دیکھ کر اور بے روزگاری
کی شکایت سن کر مجھے خیال آیا کہ خدا ساز بات ہے نواب شیدا کی سرکار میں تم کو رکھوا دونگا۔
اللہ چاہے تو تمہاری وہاں خوب گذریگی اور ان کی فرمائش بھی پوری ہو جائیگی۔

خورشید حسین۔ خان صاحب آپ یہاں کس تقریب پر رونق افروز ہیں؟

خان صاحب۔ میں یہاں تحصیلدار ہوں۔ اور مجھے یہاں تین برس ہو گئے۔ خیر اب تو شام
ہو گئی تم گھر کو جاؤ اور میں بھی ایک ضرورت سے موری دروازے جاتا ہوں۔ کل تم کچہری کے وقت
سے پہلے قابل عطار کے کوچے میں میرے مکان پر آ جانا۔ میں تمہیں چٹھی ضرور[illegible] اچھا دونگا
[illegible] نواب شیدا صاحب کے پاس لیجا کر ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے آؤنگا۔
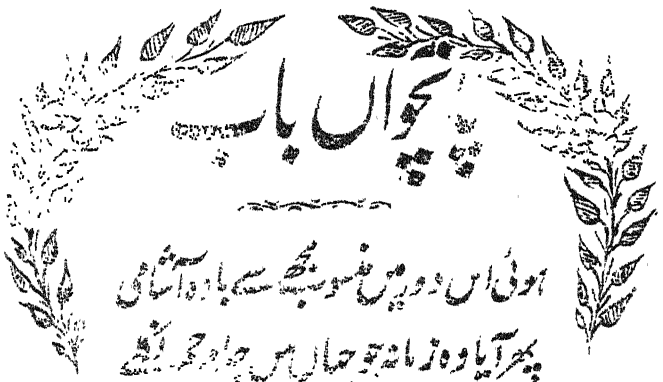
خورشید حسین صبح کی نماز پڑھ کر گھر سے [illegible] خان
صاحب کے مکان پر پہنچا۔ دیکھا تو خان صاحب ایک آرام کرسی پر بیٹھے ہیں۔ سامنے حقہ
رکھا ہے۔

خورشید حسین۔ آداب بجا لاتا ہوں۔

خان صاحب۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]

آٹھواں حصہ اس میں سے متوفیہ کے خاوند یعنی شیدا کے باپ کو پہنچتا تھا مگر سماۃ نے قبل از وقت وصیت کی تھی کہ میری یہ ساری جائداد بلا شرکت غیرے میرے اکلوتے بیٹے کو ملے۔ اس واسطے وہ کئی لاکھ کی قیمتی جائداد تمام و کمال شیدا کے ہاتھ لگی اور بلی کے بختوں چھینکا ٹوٹا لیکن ؎

تہی دستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آب حیواں تشنہ مے آرد سکندر را

شیدا کو یہ وہم پیدا ہوا کہ جب بنارس کے مہاجنوں کو معلوم ہوگا کہ میرے پاس ایسی قیمتی جائداد آئی ہے تو وہ نالش کرکے اپنے قرضے میں نیلام کرالیں گے اور میں [illegible]ونگا۔ اس لئے یہی مناسب ہے کہ اس جائداد کو بیچ کر نقد روپیہ کرلوں اور گلچھرے اڑاؤں۔ یہ بھنک شیدا کے باپ کے کان میں بھی پڑ گئی [illegible] نے دو چار آدمیوں کو بیچ میں ڈال شیدا سے اس [illegible] پچاس ہزار روپے کے بدلے اپنے نام لکھوالیا اور شیدا پچاس ہزار نقد گرہ میں باندھ [illegible] کے ڈر سے دہلی چلا آیا اور نواب رکن الدولہ کا عالی [illegible] کرایہ پر لے چاندنی چوک میں رہنے لگا۔ چونکہ یہ مکان بیچ چاندنی چوک میں ہے اور ہر خاص و عام کی گذرگاہ [illegible] شام کے قریب حسن افروز نام [illegible] کی مشہور رنڈی چرٹ میں بیٹھکر ان کے مکان کے نیچے سے گذری۔ یہ اپنے کمرے کے سامنے کرسی پر بیٹھے تھے۔ رنڈی کا پندرہ سولہ برس کا سن۔ شباب کا عالم۔ گول [illegible] چہرہ۔ چاند جیسے رخسار۔ سر سے پاؤں تک نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی۔ بوٹی بوٹی میں ناز و انداز بھرا ہوا آنکھ ملتے ہی قیامت آگئی۔ بے اختیار شیدا [illegible]

درون سینۂ من زخم بے نشاں زدۂ
بحیرتم کہ عجب تیر بے کماں زدۂ

[illegible] مکان پر پہنچے۔ بات چیت ہوئی تو معلوم ہوا عورت قابل ہے شعر بھی کہتی ہے۔ بقول شخصے ع

خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے [illegible] دو

نوجوان مسندِ زرنگار پر تکیہ سے لگا بیٹھا ہے۔ اگرچہ لباس اس کا اس وقت صرف ایک
ململ کا باریک اور ڈھیلا ڈھالا کرتا اور نین سکھ کا اریب پائجامہ ہے اور سر پر بکا مذاق
کی ہلکی ٹوپی ہے مگر اس سادگی پر بھی ریاست اور سرداری کی شان اس کے سراپا سے ظاہر
ہو رہی ہے چہرہ نہ گول ہے نہ لمبا آنکھیں بڑی بڑی اور ان میں لال لال ڈورے جو ہمت
اور سخاوت کی دلیل ہیں۔ ڈاڑھی خوب منڈی ہوئی اور مونچھیں بڑھی ہوئی ہیں جنہوں
نے ہونٹوں کی دلفریبی اور دانتوں کی آبداری کو چھپا رکھا ہے اور اس کے پہلو میں۔ ایک
آئینہ نازنین پری تمثال بنارس کی ریشمی ہلکی ساڑھی باندھے اور [illegible] دوپٹہ اوڑھے ایسے
ناز و انداز سے بیٹھی ہوئی ہے کہ اگر فرشتہ کی نظر بھی اس پر پڑ جائے تو بیخود ہو کر رہ جائے۔
مسند کے چاروں طرف چند مصاحب اور احباب بھی بیٹھے ہوئے تھے جن میں سے
بعض بعض کی صورت سے ہم بھی آشنا ہیں کیونکہ وہ دہلی ہی کے رہنے والے ایسے مشہور
شہدے ہیں۔ نوجوان مسند نشین کے سامنے بادۂ فرنگ سے لبریز صراحیاں اور جام سب
رکھے ہوئے ہیں۔ اور صبوحی اڑ رہی ہے۔ اور سب مست ہو رہے ہیں۔

وہی نوجوان امیرزادہ۔ کیوں میرزا مغل صاحب آپ نے کوکا پنڈت کی لذت النسا میں
عورتوں کی قسمیں جو لکھی ہیں وہ تو ضرور پڑھی ہوں گی۔

میرزا مغل۔ جی پڑھی ہیں۔ چترنی۔ ہستنی۔ شنکھنی۔ پدمنی۔

امیرزادہ۔ درست معلوم ہوا انشاء اللہ آپ کا مذاق اچھا ہے اور ہر طرف نگاہ بھی ہے۔

چھمن خان۔ حضور ہمارے میرزا مغل صاحب چھپے رستم ہیں۔ اور اس کام کا تو بانا
باندھتے ہیں۔

امیرزادہ۔ بھلا آپ نے پدمنی عورت کبھی دیکھی ہے۔

میرزا مغل صاحب (ذرا سوچ کر) حضور سچ تو یہ ہے کہ [illegible] نظر نہیں آئی
سنا ہے کہ سنگلدیپ میں پیدا ہوتی ہے۔

امیرزادہ۔ تو پھر مجھ سے بھی دیکھئے۔ بارہ برس دلی میں پھرے [illegible]
[illegible]

آنکھوں والا ترے جوبن کا تماشا دیکھے
دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

پڑھنا اور ہے اور گننا اور ہے۔ لیجئے میں آپکو پدمنی یہیں بیٹھے بیٹھے دکھائے دیتا ہوں (رنڈی کی طرف اشارہ کرکے) یہ بی صاحبہ پدمنی نہیں اور کیا ہیں۔

حسن افروز (ناز سے تیوری چڑھا کر) دیکھو نواب صاحب مجھے یہ باتیں اچھی نہیں لگتی ہیں۔ مردوی پدمنی کون بلا ہوتی ہے۔ میں تو اُسے اپنی ایڑی چوٹی پر سے قربان کرتی ہوں۔

نواب صاحب - قدر زر زرگر بداند بالا معلوم شد ؎

گر پدمنی کہے سے بُرا مانتی ہو تم
میری طرف کو دیکھئے میں پدمنی سہی

خواجہ بادشاہ صاحب (نشہ میں چونک کر) واہ واہ سبحان اللہ سبحان اللہ کیا حاضر طبیعت ہے فوراً شعر بنا دیا۔

نواب صاحب (اترا کر) اے جناب کیا عرض کروں لکھنؤ میں دو دو ہزار شعر میں نے مشاعرے میں بیٹھے بیٹھے تصنیف کرکے سنا دیا ہے۔

ذوقی لال مصور - اللہ تیری پناہ - اچھی بے پرکی اڑائی - دو دو ہزار شعر کہیں آسمان نہ ٹوٹ پڑے - اتنا مبالغہ - توبہ توبہ -

نواب صاحب کے کان اس کے عادی نہ تھے کہ کوئی چھوٹی یا بڑی بات کی کوئی تردید کرے۔ اس لئے ذوقی لال کی گفتگو سن کر آپے سے باہر ہوگئے اور کہنے لگے آپ بڑے نامعقول آدمی ہیں جو ہماری بات کی تردید کرتے ہیں۔

ذوقی لال (بگڑ کر) میں نامعقول کے کہنے کو بُرا نہیں مانتا ہوں اور اگر آپ مجھے نامعقول کہتے ہیں تو آپ دو دفعہ نامعقول۔

نواب صاحب یہ جملے کو سن کر غصہ کے اندھے ہوگئے - ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا وہ ذوقی لال کے منہ پر دے مارا ایک تو شیشہ آتش پروف اور پھر لگا قریب کے ہی چور چور ہوگیا اور تمام چہرہ ذوقی لال کا زخمی کر دیا اور خون کے فوارے بہنے لگے۔

ذوقی لال قیصر آباد کا رہنے والا تو تھا نہیں جو نواب صاحب [illegible] تھا۔ دہلی کا باشندہ اور شعر و [illegible] اُس نے نواب صاحب کو وہ کھری سُنائیں کہ نشہ ہرن ہوگیا اور وہ نواب صاحب کی طرف لپکا تاکہ جو مضمون زبان سے کہنے میں رہ گیا ہے وہ ہاتھ سے ادا کردے اور نواب صاحب کو معلوم ہو جائے کہ ریاست کی شوکت اور دولت کا گھمنڈ اپنے تعلقہ کے سوا دہلی میں نہیں چلتا ہے اور نواب صاحب بھی اُس کی طرف بڑھے مگر افسوس کہ یہ ایکٹ [illegible]۔ ذوقی لال کو ان کے دوست چمن خان نے روکا اور نواب صاحب کے پاؤں کے تلووں میں گلاس کے ریزے اور ٹکڑے بیٹھ گئے ۔ اور وہ ہائے کرکے گر پڑے ۔ اُن کے گرنے سے کلی کو ٹھوکر لگی جو مسند کے قریب رکھی تھی اور اُس کی چلم کے دہکتے ہوئے کوئلے حُسن افروز کے پیٹ پر جا پڑے اور اس کے پیٹ کا چھرتا [illegible] مسند پر اُس وقت لیٹے لیٹے یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ اب یہ محفل مقتل بن گئی ۔ بی حسن افروز ایک طرف تڑپ رہی ہیں تو ایک جانب نواب صاحب بلک رہے ہیں۔ ہائے میرے تلووں میں گلاس کے ٹکڑے نشتر کی طرح چبھ رہے ہیں۔

ذوقی لال الگ کراہ رہا ہے [illegible] اُس کے ساتھ کے [illegible] ہیں۔ حسن افروز کے آبلوں پر سفیدہ کاشغری اور انڈے کی سفیدی لگائی گئی۔ اس اودھم اور [illegible] تمیزی میں شراب کی [illegible] بھی گر کر ٹوٹ پھوٹ گئے [illegible] میں شراب پڑی بہنے لگی اور سارا مکان [illegible] کی بدبو سے سڑ گیا۔ اس ہڑبونگ میں [illegible] وہاں پہنچے اور [illegible] رعب صورت کو دیکھ کر سب ٹپا گئے اور خاموش [illegible] بیٹھ گئے۔ مگر حسن افروز کراہتی رہی کیونکہ آبلوں کی جلن نے اُسے بیتاب کر رکھا تھا۔

[illegible] ذوقی لال مصور نے خان صاحب کو نواب [illegible] اپنا خون آلود [illegible] دکھایا اور کہا میں کوتوالی میں جا کر رپٹ کرتا ہوں۔
خان صاحب بڑے فہیم اور عقیل آدمی تھے سمجھے کہ پولیس نوابی وارداتوں کے پیچھے [illegible] کرتی ہے اور [illegible] نوابزادوں کا بڑے شوق سے شکار کرتی ہے اگر ذوقی لال

[illegible]

اس واسطے خان صاحب نے اُس وقت بڑی دانائی سے کام لیا اور ذوقی لال کو اس طرح بہلایا:-

خانصاحب - بیشک آپ کے ساتھ نواب صاحب نے زیادتی کی مگر میرے نزدیک اس میں اُنکا ذرا بھی قصور نہیں ہے - یہ شراب خانہ خراب ہے - اس نے ہاروت اور ماروت فرشتوں سے خون کرا دیا تھا یہ لڑائی اور تو تو میں میں تو اس کی گزک ہے مگر آج تک یہ نہیں سُنا کہ یاران ہم نوالہ و ہم پیالہ ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں اور کوتوالی چبوترے جائیں۔

الغرض خان صاحب نے اپنی شیریں زبانی اور ہوشیاری سے ذوقی لال کے غصے کو بجھایا اور ادھر شیدا کو سمجھایا اور چند منٹ میں انکو گلے ملوا دیا - چونکہ تحصیلدار صاحب شیدا کے باپ کے ملنے والے تھے - اس نے ان کے حکم سے ذرا سرتابی نہیں کی - جب یہ جھگڑا [illegible] صاحب نے فرمایا - حضرت میں وہ منشی تجویز کر کے ساتھ لیتا آیا ہوں۔

نواب شیدا - میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں - آپ جن کو لائے ہیں وہ ہر طرح قابل [illegible] اور معتبر ہونگے -

خان صاحب - بیشک وہ بڑے شریف اور نیک اور [illegible] ہیں - آپ کو ان کی شرافت اور نیک بختی کا [illegible] رہینگے -

نواب شیدا - نہیں نہیں آپ سمجھا [illegible] ان بیہودہ باتوں سے کیا واسطہ۔

[illegible]

رکھونگا - بلوائیے وہ ہیں کہاں؟

خانصاحب - [illegible] آیا ہوں [illegible] -

نواب شیدا صاحب - کون ہے -

خادم - حاضر کیا حکم ہے۔

نواب شیدا صاحب - دیکھو ایک صاحب [illegible] کے مکان میں [illegible] کے پاس بیٹھے ہیں ان سے کہو کہ آپ کو خان صاحب [illegible] ہیں [illegible] ساتھ [illegible] -

[illegible]

[illegible] پاس بیٹھنے والوں کی سمجھ میں نہیں آئے۔ مگر قرینہ یہ کہتا تھا [illegible] کی کوئی خاص سفارش شیدا سے کی ہے۔ شیدا نے اس کے جواب میں اچھا کہا۔ اتنے میں خورشید کمرے پر پہنچا اور اس نے شیدا کو سلام کیا۔

نواب شیدا۔ وعلیکم السلام آئیے بیٹھ جائیے۔

خورشید بیٹھ گیا۔

شیدا۔ آپ کا نام [illegible] شید حسین ہے۔

خورشید۔ جی میرا نام خورشید ہے۔

شیدا۔ میں نے خان صاحب کے فرمانے کے موافق آپ کا [illegible] روپیہ مشاہرہ علاوہ کھانے کے مقرر کیا۔ پس آپ آج ہی سے میرے ہاں لکھنے پڑھنے کا کام دیجئے اور پچیس روپے بطور [illegible] آپ کو دیتے جاتے ہیں کیونکہ خان صاحب [illegible] داری اور ناداری کی کیفیت مجھ سے بیان فرمائی ہے۔

خورشید۔ [illegible] روپیہ لیکر [illegible] سلام کر کے۔ حضور کی قدر دانی اور خان صاحب کی مہربانی۔

شیدا۔ [illegible] مخاطب ہو کر) امام بخش خانساماں کو بلاؤ۔

امام بخش۔ حضور میں حاضر ہوں۔

شیدا۔ خورشید حسین کو نیچے لیجاؤ اور جس سہ دری میں شیخ صاحب مرحوم لکھا پڑھا کرتے تھے اُن کو بٹھاؤ۔ اور یہ وہیں بیٹھا کریں۔ اور ہمارے مصارف کا روزنامچہ اور خط خطوط لکھا کریں۔

امام بخش۔ بہت خوب۔

خورشید حسین امام بخش کے [illegible] نیچے [illegible] اپنے کام میں مشغول ہوئے اور [illegible] مسلسل پہنچے۔

[illegible] آؤ خورشید حسین [illegible] خدا جانے کیا سبب [illegible] بارہ آٹھ بجے کے بعد

یہ گھر پہنچے اور اپنی ساس سسروں کے سامنے اپنی نوکری کا سارا قصہ [illegible] پچاس
جیب سے نکال اُمتہ کے ہاتھ میں دئیے۔ خورشید کی نوکری [illegible] خوش ہوئے
اور اُمتہ باغ باغ ہو گئی۔ اور اس نے دوسرے ہی روز سودا سلف [illegible]
کھانے پکانے لگی۔

ساتواں باب

[illegible]

[illegible]
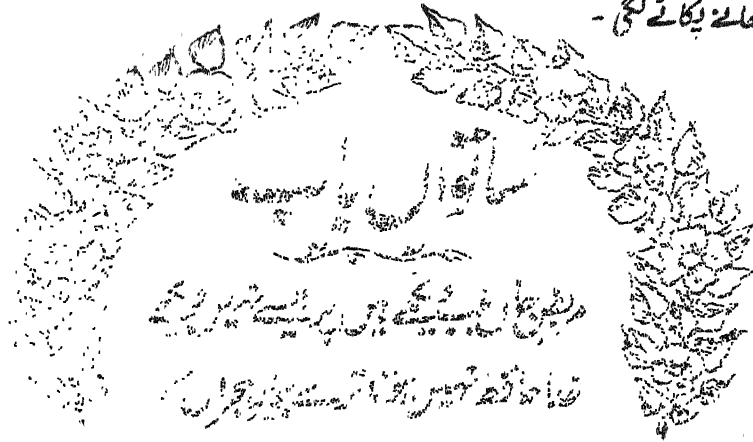
امام بخش۔ (خورشید حسین سے مخاطب ہو کر) آج منشی جی کو مرے [illegible] جب
سے آج تک ایک کوڑی کا حساب نہیں لکھا گیا۔ آپ کاغذ لیکر بیٹھ جائیے اور جو میں بتاتا
جاؤں وہ لکھتے جائیے۔

خورشید۔ بہت اچھا بتائیے۔

امام بخش۔ لکھئے وسکی بوتل ایک درجن۔

خورشید۔ کس کی بوتل؟

امام بخش۔ کس کی نہیں وسکی بوتل۔

خورشید۔ وسکی کس کی؟

امام بخش۔ منشی جی آپ کیا فرماتے ہیں۔ میں کہتا ہوں وسکی بوتل آپ کہتے ہیں کس کی۔
یہ بات کیا ہے؟

خورشید۔ خانساماں جی میں سمجھا نہیں آپ وسکی کس کو کہتے ہیں [illegible]
کی بوتل شربت فالسہ کی انگور کی؟

انعام بخشیں۔ آپ نے دہلی کے بازاروں میں سانولے رنگ کی عورتوں کو چلتے پھرتے دیکھا ہو گا۔
وہاں اودے چمپئی رنگ کی ساڑھیاں باندھے ایسے ہی دوپٹے اوڑھے۔ ڈھیلے ڈھیلے کرتے پہنے
پٹیاں جمائے در رہیں کا چہرہ ہوتا ہے اور بظاہر ان کے بناؤ اور وضع سے یہ ظاہر ہوتا
ہے کہ یہ ادنیٰ درجے کی رنڈیاں ہیں۔ مگر درحقیقت یہ کنجریاں ہوتی ہیں علاوہ کسب کے انکو فحش
اور گالیاں بکنے میں دستگاہ ہوتی ہے اور اسی وجہ سے یہ پوچھی جاتی ہیں جو لوگ زندہ دل
ہوتے ہیں وہ دس بیس کنجریوں کو اپنے مکان پر بلا لیتے ہیں اور یہ عورتیں دو پارٹیاں بناتی ہیں
ایک پارٹی دوسری کو گالیاں دیتی ہے اور گندہ اور ناپاک مغلظات فحش سے گرا کے اپنے
حریف کو شکست دینا چاہتی ہے۔ خدا ان گالیوں کو نہ سنوائے۔ میرزا فیض السوداکی روح
اپنی گور میں شرما جاتی ہے اور شیطان لاحول پڑھ کر بھاگ جاتا ہے اور سننے والے خوش
ہوتے ہیں اور ہنستے ہیں۔

خورشید حسین کی رہی سہی عقل اس قصے کو سن کر کھوئی گئی اور دل میں کہنے لگا سبحان اللہ
دولت بھی کیا چیز ہے جس کے ہاتھ آتی ہے فرعون اور شداد بن جاتا ہے اسی طرح بیس دن
کا حساب اس نے لکھا۔ ان بیس دن میں اگر لگائی تو دو ہزار روپیہ بیٹھتے مگر اس دو ہزار میں ایک پیسہ
خیرات یا اللہ کی راہ کا نہ تھا۔ اور یہ دو ہزار روپیہ فسق و فجور میں خرچ کئے گئے تھے دسمبر ۱۹۰۳ء
تک نواب شید اکی سرکار میں خورشید حسین کی بھی گذری۔ شریف نواب نے اس مدت میں خورشید
سے یہ بھی نہ پوچھا کہ تمہارے منہ میں کے دانت ہیں مگر ع

روح را صحبت ناجنس عذابیست الیم

خورشید حسین کو نواب شید ا کے پاس دن بھر بیٹھ کو جا کر بیٹھنا بھی شاق گذرتا تھا کیونکہ وہ
اور اس کے سارے ہمنشین ہر وقت نشے میں مخمور رہتے تھے اور ہر آن اور ہر دم سب کے
منہ پر گندی گالیاں اور فحش ہوتا تھا جس کے سننے کو ایک نیک آدمی کسی طرح گوارا نہیں
کر سکتا ہے مگر بیچارہ کی بیچارگی مشہور ہے۔ چار و ناچار یہ مصیبت اس کو سہنی پڑتی تھی ۵۰ روپے
کی تنخواہ میاں کا کھانا علاوہ تنخواہ کے۔ ایک کا خرچ ہوتا تھا اور وہ اچھے سے اچھا کھاتی
تھی اور اچھے سے اچھا پہنتی تھی۔ اور وہ نیا جیسا جو کبھی احمد آباد سے پڑ لیتے پائجامہ کا

کُرتہ پہنتی [illegible] تھیں ہر وقت گوٹا اور توئی کرن کے کرتے اور ٹوپیاں پہنتی تھیں اور ماں باپ ہاتھوں چھاؤں کرتے تھے ۔ مگر افسوس ہے کہ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء سے اس چرخ زنگاری نے رنگ بدلا اور اس بدنصیب کے عیش میں خلل کے آثار پیدا ہو چلے ۔ خورشید کو بخار آنا شروع ہوا اور بیس روز تک نہ اُترا۔ حکیم نورالدین صاحب کے صاحبزادے حکیم جو حافظ صاحب کے لقب سے مشہور ہیں گھر کے پاس رہتے تھے ۔ جب انہوں نے بہت سے پاشوئے کرائے اور مسہل کرائے تو بخار اُتر گیا مگر خفیف حرارت جو خورشید کے رگ و پے میں اثر کر گئی تھی کسی طرح نہ گئی لوگوں نے کہا [illegible] بخار کے واسطے اچھا ہوتا ہے ۔ بابو بھیم چندر کا معالجہ شروع کیا گیا ۔ مگر ؎

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

انگریزی دوا نے خورشید حسین کی طبیعت کے ساتھ وہ کام کیا جو دیا سلائی بارود کے ساتھ کرتی ہے ۔ [illegible] ڈول ڈول گھل [illegible] کی بھی طاقت نہ رہی ۔ گو حاذق الملک رحلت کر چکے تھے مگر [illegible] محمودخانی شان و شوکت کو حکیم واصل خاں نے سنبھال رکھا تھا اسلئے عزیزوں کی رائے ہوئی کہ خورشید حسین کو اُن کے پاس لیجانا چاہیئے چنانچہ حکیم صاحب نے خورشید کی نبض دیکھ کر [illegible] صاحب سے کہا کہ [illegible] ۔ [illegible] میں کہاروں سے کہو ڈولی لیجائیں آپ [illegible] ٹھیریئے ہم نسخہ لکھ [illegible] ۔ جب ڈولی چلی گئی تو حکیم واصل خاں صاحب نے [illegible] ہے ۔

حافظ صاحب ۔ یہ میرا داماد ہے ۔

حکیم صاحب ۔ اس کو دق ہے اور دق کا [illegible] تیسرا درجہ [illegible] ۔ [illegible] مگر [illegible] چاہیئے [illegible] یہ دوا [illegible] کا حال [illegible] اس کے علاج میں کوشش کرونگا ۔

[illegible]

پریشان ہو گئیں [illegible] آگے بڑھ کر جو کچھ واصل خاں صاحب نے خورشید کے متعلق فرمایا تھا
ان سے [illegible] ۔ امتہ الحسن حال کو سُن کر بدحواس ہو گئی۔ اور [illegible] کہ روئے پیٹے اور
چیخے چلائے [illegible] نے کہا بیٹی خدا کے واسطے ایسا غضب نہ کرنا۔ تیرا رونا پیٹنا سُن کر
بولا جائیگا اور مرنے سے پہلے ہی مر جائے گا۔ منہ سے اُف نہ نکال اور اپنے جی کو سنبھال۔
رونے [illegible] دے گی۔ اسی وقت حافظ صاحب نے قاضی انوار حسین صاحب کے نام
ایک خط خورشید [illegible] کا حال تحریر کرکے اورنگ آباد بھیجدیا۔ خط کے پڑھتے ہی
قاضی جی [illegible] بھائی کی [illegible] راتوں رات چل کر دہلی پہنچے اور جس وقت
انہوں نے اپنے نوجوان بھائی کا تباہ حال دیکھا تو بے اختیار ان کے منہ سے چیخ نکل گئی اور
ادھر خورشید [illegible] کر دم اُکھڑ گیا۔ جب دونوں کی آگ کو آنسوؤں کے پانی نے ٹھنڈا کیا تو
بھائی بھائیوں [illegible] باتیں ہونے لگیں۔

قاضی جی [illegible] سے بیمار رہو اور مجھے تم نے ایک پوسٹ کارڈ بھی نہ لکھا
[illegible] کو ہلاک کروالیا۔

خورشید۔ [illegible] آیا تھا تو ہفتے کے ہفتے آپ کے پاس [illegible] مگر آپ نے کبھی
[illegible] بھائی صاحب ناراض ہیں۔ ناچار میں نے بھی خط لکھنا چھوڑ دیا اور جب
بیمار ہوا ہوں مجھے اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہیں خط کون لکھتا یا لکھواتا۔

قاضی جی [illegible] خیر جو کچھ ہوا وہ ہوا مگر اب میری رائے ہے کہ تمہیں اورنگ آباد لے چلوں۔
[illegible] بہت [illegible] ۔ دوسرے دہلی سے اورنگ آباد کی آب و ہوا
[illegible] حکیم احمد حسین صاحب [illegible] اور وہ اپنے وقت
کے مسیحا ہیں ان سے رجوع کریں گے۔ امید ہے کہ تم بہت جلد تندرست ہو جاؤ گے۔
چونکہ خورشید حسین کا خمیر اورنگ آباد کا ہی تھا اور فرشتوں نے اُس کی چکنی مٹی وہیں سے اٹھائی
تھی اسواسطے باہر جانے کو فوراً راضی ہو گیا۔ امتہ نے کہا میں بھی ساتھ چلونگی۔ مگر قاضی جی نے کہا
تمہارے چلنے سے مجھے دوہری دقت اٹھانی پڑیگی تم یہیں رہو۔ اس لئے وہ ناچار رہ گئی
[illegible] تقدیر میں یہی لکھا تھا کہ میاں مرتے وقت اپنی پیاری بی بی اور لاڈلی بیٹی کی

صورت نہ دیکھے۔ اس لئے خورشید نے بھی بیوی سے یہی کہا کہ اوّل تو مجھے خدا سے امید ہے دس بیس روز میں ہی اچھا ہو جاؤنگا اور دہلی چلا آؤنگا اور اگر خدانخواستہ میرے اچھے ہونے میں دیر ہوئی تو میں تمہیں اورنگ آباد بلالونگا۔ مگر اس وقت تمہارا نہ چلنا ہی مناسب ہے۔

خورشید کا اس مایوسی اور بیماری کے عالم میں دہلی سے جانا قیامت کا تھا۔ امۃ نے ہرچند ضبط کیا اور بہتیرا جی کو سنبھالا مگر اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی اور چیختے چیختے اس کا سانس اکھڑ گیا تھا۔

خورشید پہلے ہی تو صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ ہی تھا بیوی کے چیخنے نے اس کے کلیجہ میں بھالا مارا اور وہ ایک آہ کر کے بیہوش ہو گیا۔ اور بیہوشی اتنی دیر تک رہی کہ سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور سمجھے کہ شاید ہو چکا۔ مگر نہیں ابھی اس کو کچھ دن دنیا کی اور ہوا کھانی تھی جس واسطے اس نے آنکھ کھولی اور حسرت آمیز باتیں بیوی سے کر کے اور اپنی لڑکی کو گلے لگا کر اورنگ آباد چلا گیا۔
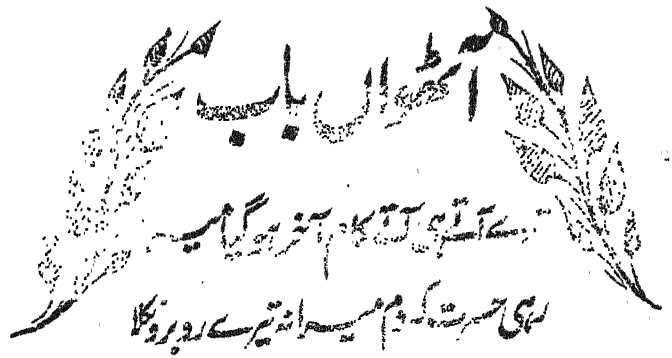
حکیم احمد سعید صاحب۔ آپ کو بیمار ہوئے کتنی مدت ہوئی۔

خورشید۔ [illegible]

حکیم صاحب۔ بخار کے ساتھ آپ کو کبھی خون آیا ہے۔

خورشید۔ جی نہیں۔

حکیم صاحب۔ آپ کی طبیعت دوپہر کے کھانے کے بعد کیسی رہتی ہے۔

اورنگ آباد نہ چلی آئے اور مجھے اُس کے کھانے پینے کا ڈنڈ نہ پڑے - آخر کار سولہویں اپریل ہفتے کا دن آگیا - اور خورشید کو جانکنی شروع ہوگئی -

خورشید - کیوں بھائی خط کو گئے کے دن ہوئے -

قاضی جی - چار دن -

خورشید - خط تو دہلی دو سکر دن پہنچ جاتا ہے پھر کیا سبب جو وہاں سے اب تک کوئی نہیں آیا -

قاضی جی - دہلی کے آدمی ذرا نازک مزاج ہوتے ہیں - اور چلنا پھرنا تو وہ لوگ جانتے ہی نہیں - آجائیں گے ہفتے دو ہفتے میں -

خورشید - ہفتے دو ہفتے میں آکر کیا دیکھیں گے مجھے تو اب اپنے جینے کی دو دن کی بھی آس نہیں -

قاضی صاحب - کیوں فالِ بد نکالتے ہو مرنا بڑی مشکل ہے -

خورشید حسین - ایک آہِ سرد بھر کر ؎

لکھوں کیا حال میں کہ ستم اٹھ نہیں سکتا پر ضعف سے ہاتھوں میں قلم اٹھ نہیں سکتا
بیمار ترا صورتِ تصویرِ نہالی کیا اٹھے سرِ بسترِ غم اٹھ نہیں سکتا

چونکہ خورشید حسین کو بیوی اور اپنی پیاری بیٹی حمیدہ کا انتظار رہتا اور وہ آنکھ خیال میں گڑا ہوا تھا اس واسطے بار بار وہ دروازہ کی طرف تکتا تھا اور اُن کے اشتیاق میں اُس کی جان نکل رہی تھی مگر دلّی دور تھی۔ اور اُس کی بیوی بیٹی کو اُس سے کوسوں کا فاصلہ تھا - اسی انتظار میں اُسنے پھر ایک دفعہ دروازے کی طرف دیکھا اور یہ شعر پڑھا ؎

ترے آتے ہی آتے کام آخر ہو گیا میرا
رہی حسرت کہ دم میرا نہ تیرے سامنے نکلا

شعر کے ساتھ ہی اُس ناتواں کی جان تن سے بھی نکل گئی۔ قاضی صاحب اور اہلِ اشتیاق تاکتے ہی رہ گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔
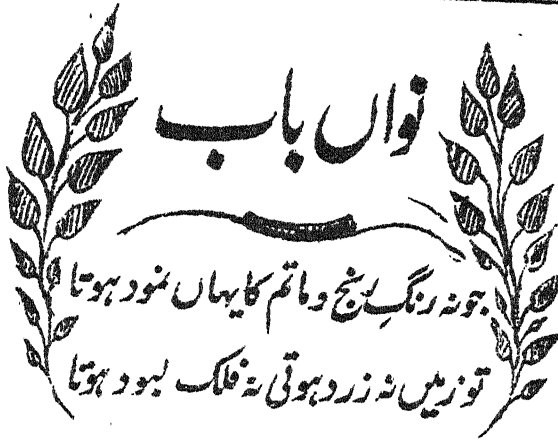
محرم الحرام کی تیسویں اور اپریل ۱۹۰۴ء کی سترہویں ہے۔ دن کے بارہ بجے ہیں۔ اس ماتمی مہینہ کے دن جیسے بھیانک اور پُرحسرت ہوتے ہیں ان کے بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

آفتاب گو اس وقت بیچ آسمان میں ہے مگر حسین مظلوم کے ماتم میں اُس نے اپنے نورانی چہرے پر خاک مل لی ہے۔ اس لئے اُس کی روشنی مدہم پڑ گئی ہے۔ دھوپ کی لپٹیں نہیں شعاعیں گویا آنسوؤں کی لڑیاں ہیں۔ جن کا آسمان سے زمین تک تار بندھ رہا ہے۔ درد و غم کی آگ میں پڑے تپ رہے ہیں اور اشکوں نے یہاں تک جوش مارا ہے کہ جب آنکھوں سے نکلنے کو راہ نہ پائی تو پسینہ بن کر مسام بدن سے ٹپک رہے ہیں۔

حافظ احمد علی صاحب اپنے مکان میں بیٹھے ہیں۔ سامنے دسترخوان بچھا ہوا ہے کھانا چُنا ہوا ہے اور وہ اور ان کے بیوی بچے سب کھانے میں مشغول ہیں۔

اُمتہ ۔ دیکھا بی اماں جان وزیرن کو لاکھ سمجھاؤ مگر یہ کمبخت عادت سے باز نہیں آتی جب سالن پکائے گی نمک زہر کر دیگی۔ میرے منہ میں تو ذرا سا لقمہ گیا تھا۔ خدا جانے کتنا لون جھونک دیا ہے۔

اُمتہ کی ماں ۔ لڑکی خدا خدا کر تجھے بھی اُس کے ساتھ کچھ خصومت ہو گئی ہے۔ اچھا پکائے تو بھی بُرا کر دیتی ہے۔ آج تو لون ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ ابھی اُمتہ نے ماں کو کچھ جواب نہ دیا تھا۔

شام تک اور شام سے صبح تک چھپا کرتی تھی اُس کی آب اُتر گئی ہے اور اگر کبھی ملتی تھی تو
تو کر وہ جیسے کسی ناول کے عاشق کی آہ سرد جیسے اٹھی اور دم بدم آکر رہ گئی ۔ وہ کہیں مستی ہو کر
گئی ہے اور اسے اس کے اپنے میں وفا بہن جو جگر سے پار ہو جائے

امتہ ایسی سسرال میں پہنچ گئی ہے۔ اور جو اجلے کپڑے پہنے قاضی جی اور ان کی بی بی سے
زیادہ اُس کی خاطر تواضع کرتی ہیں اور اُس کو پلنگ سے نیچے پاؤں نہیں اتارنے دیتی ہیں اور
منور علی حسن کا پندرہ سولہ برس کا بس ہے وہ تو ہر وقت امتہ کے پاس بیٹھا رہتا ہے اور
ممانی جان کہتی ہیں اُس کا منہ سوکھتا ہے۔

حمیدہ کو قاضی جی نے گلے کا ہار بنا لیا ہے اور اُسے ہر وقت گود میں چڑھائے
پھرتے ہیں۔

شام ہو چلی ہے اور آفتاب غروب ہونے والا ہے شفق پھول رہی ہے اور تمام آسمان
ایسا لال ہو رہا ہے جیسے کوئی غمزدہ اپنے منہ کو پیٹ پیٹ کر لہولہان کر لیتا ہے۔

امتہ پیچھے کے مکان میں بیٹھے بیٹھے گھبرا گئی ہے اس واسطے دل بہلانے کو کوٹھے پر چلی گئی ہے
چونکہ گاؤں اور قصبہ میں دو منزلہ سہ منزلہ اور بلند مکانات بہت کم ہوتے ہیں اس واسطے نگاہ
کی نظر کو کوئی روکتا نہیں ہے اور شام کے سین کو وہ بخوبی دیکھ رہی ہے جہاں تک نگاہ کام کرتی
ہے ہرے بھرے کھیت اور سرسبز باغ نظر آ رہے ہیں اور دوپہر ڈھلے لالوں میں آفتاب
کی شعاعیں پڑ رہی ہیں اور زمین سے آسمان تک آگ لگی دکھائی دیتی ہے
اُس پر آنکھ نہیں ٹھہر سکتی ہے پرندوں کی قطاریں اڑتے کچھ متفرق اڑ رہے ہیں اور آشیانوں
میں جا کر بسیرا لے رہے ہیں ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور یہ نظارہ بہر حال تفریح بخش ہے۔
مگر افسوس ہے کہ امتہ کو اس سے بھی کچھ فرحت حاصل نہ ہوئی۔ اور وہ اس بدلی تماشہ کا لو کر
رلائی اور چپکے چپکے یہ شعر پڑھنے لگی ؎

بستی میں دل لگتا نہیں ویرانے سے گھبرا اٹھی
اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

ناگاہ ڈیوڑھی میں سے صدا آئی بھائی صاحب!

قاضی جی (اندر مکان میں سے) بھائی عاشق حسین

(آواز ڈیوڑھی کی) جی عاشق ہی ہے۔

قاضی جی۔ منور علی بیٹا اکوٹھے پر جا کر اپنی ممانی سے کہہ دو کہ پیچھے آ جا پردہ ہے۔

امۃ کوٹھے پر عاشق حسین کو پکارتے سنے چونکی اور سوچنے لگی الٰہی یہ عاشق حسین کون ہیں میں پہلے سسرال میں رہ گئی ہوں عاشق حسین نام تو کبھی نہ سنا تھا یہ نئے بھائی کہاں سے آ گئے۔ اس میں منور علی دوڑا دوڑا اوپر آیا اور صرف یہ کہہ گیا کہ بی ممانی جان پیچھے ہٹ آنا پردہ ہے امۃ اُس کو بلاتی رہ گئی مگر وہ چلا گیا۔ ادھر قاضی انوار حسین نے کہا بھائی صاحب آئیے اندر تشریف لے آئیے، اور عاشق حسین گھر میں آ گئے۔

چونکہ امۃ کھڑی ہوئی تھی اس لئے بے ارادہ اُس کی نظر عاشق حسین پر پڑی اور اُس نے دیکھا کہ ایک شخص جس کی اندازاً پچاس برس سے کم عمر نہ ہو گی کالا رنگ چہرہ پر چیچک کے داغ گہرے گہرے داغ داڑھی چڑھائے عینک لگائے سفید کوٹ انگریزی فیشن کا پہنے سر پر فلٹ ہیٹ اور ہاتھ میں چاندی کی گگی۔ چاندی کی چلم جس پر چاندی کا سرپوش۔ سرپوش میں چاندی کی زنجیریں چاندی کی مہنال تھی گھر میں آیا اور سلام علیک کر کے بڑی نخوت کے ساتھ قاضی جی کے پاس دوسرے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ اگرچہ لباس امیرانہ تھا اور اُس نے اپنے تئیں بنایا سنوارا بھی خوب تھا مگر داڑھی کے بالوں کی سفید جڑیں چغلی کھا رہی تھیں کہ جوانی کی رات ڈھل چکی ہے اور بڑھاپے کی صبح نمودار ہو چلی ہے۔

عاشق حسین۔ کہئے بھائی صاحب خورشید کی بیوی دہلی سے آ گئیں۔

قاضی جی۔ جی ابھی تو آج آئے ہوئے تین دن ہوئے ہیں۔ کہئے آپ جس غرض سے بلند شہر تشریف لے گئے تھے وہ حاصل ہو گئی۔

عاشق حسین۔ خدا کا شکر ہے صاحب بہادر مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور جب میں نے انہیں یاد دلایا کہ جس وقت آپ نیپال کی سرحد پر شیر کا شکار کھیل رہے تھے تو ملاقات ہوئی تھی اور میں نے حضور کو بار برداری وغیرہ کی مدد دی تھی تو اُس کو یاد کر کے بہت ہی خوش ہوئے اور [illegible] ہاتھ ملایا۔

قاضی جی - خدا آپ کو جیتا رکھے آپ ہمارے قدرداں ہیں -
عاشق حسین - آپ کی بزرگی ہے ورنہ من آنم کہ من دانم - منور علی اپنی ممانی کو میری طرف سے
دعا تو کہہ آؤ
قاضی جی کی بہن - (پردے ہی میں سے) اور بیٹا پیاری بھی اپنی ممانی کے پاس لیجاؤ -
اور بھائی کے واسطے پان سوالاؤ میرے ہاتھ آٹے میں بھر رہے ہیں میں پان بنا دیتی -
منور علی پیاری کو لے گیا اور رامتہ پان بنانے میں مشغول ہوئی اور منور علی سے پوچھنے
لگی کیوں بھئی یہ کون شخص ہیں پہلے تو میں نے ان کا نام بھی نہیں سنا -
منور علی - یہ بھی ہمارے رشتے کے ماموں ہوتے ہیں تیس برس سے نیپال کی طرف نوکر تھے
اب ان کی پنشن ہو گئی ہے اور بہت سا روپیہ کما کر گھر آئے ہیں -
عاشق حسین بیٹھے بیٹھے تنگ آگئے - اور اتنی دیر میں خدا جانے کیا کیا باتیں کر گئے
اور قاضی جی اُن کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے جب رامتہ پھر آئی تو قاضی جی کی بہن نے خود بخود
عاشق حسین کا ذکر چھیڑا اور اُن کی بڑی تعریف کی - اور کہا یہ ہمارے چچا زاد بھائی ہیں نیپال
کی سرحد پر تیس برس سرکاری نوکری کی - اب کما کما کر اور پچیس روپے مہینے کی پنشن لیکر
گھر آئے ہیں چھ برس ہوئے بیوی مر چکی ہیں - آل نہ اولاد اکیلا دم ہے شادی کی فکر میں
لگے ہوئے ہیں مگر چاہتے ہیں بیوی صورت شکل کی بھی اچھی ہو اور سلیقہ مند بھی اور مجھ سے
کہتے تھے کچھ کنواری ہی پر موقوف نہیں ہے اگر کوئی خوبصورت اور تمیزدار رانڈ مل جائیگی
تو میں اُس سے نکاح کر لونگا کیونکہ ہمارے حضرت نے رانڈوں سے نکاح کئے ہیں - رامتہ نے
اس کا کچھ جواب نہ دیا - اور عشا کی نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی - اور نماز سے فارغ ہو سو رہی -
دوسرے دن آٹھ بجے عاشق حسین پھر قاضی جی کے مکان پر آموجود ہوئے اور بیٹھے بیٹھے
دوپہر گذرے گھر کو سدھارے اور قاضی جی اُن سے بہت گھل مل کر باتیں کرتے رہے ایک دو دن تو
رامتہ کو عاشق حسین کا گھر میں آکر بیٹھنا ناگوار نہ ہوا مگر جب اُن کو آتے جاتے دس پندرہ دن ہو گئے
اور وہ دھنی دیکر بیٹھنے لگے تو اُس کو بُرا معلوم ہوا کیونکہ وہ ہر وقت پردے میں گھٹی رہتی تھی اور
اُس کو بات کرنا اور کھانا پینا کھنکارنا بھی دشوار ہو گیا تھا - سوچی کہ اگر میں نے منہ سے کہا اور انہوں نے

بُرا مانا تو ناحق اپنے دل بُرے دل ہو نگے۔ منور علی سے کہوں تو اپنی ماں سے کہیگا اور میرا مطلب نکل آئے گا۔

چنانچہ اُس نے ایکدن جب اپنی ساس کو کھانے پکانے میں مشغول اور منور کو اکیلا پایا تو کہا کیوں بھئی منور علی تمہارے ماموں عاشق حسین کیسے آدمی ہیں آکر بیٹھتے ہیں تو جانے کا نام نہیں لیتے۔ میرا تو دم ناک میں آگیا ہے پیشاب پاخانہ کا حرج مارتے مارتے ہیں تو بیمار پڑ گئی۔

منور علی بالکل بیوقوف لڑکا تھا اور دوسرے اُس کو امۃ کے ساتھ کچھ محبت بھی ہو گئی تھی اس وجہ سے بے اختیار اُس کے منہ سے نکل گیا۔ ممانی جان کا یہ ارادہ ہے کہ آپ کا نکاح ماموں عاشق سے کر دیں۔ اسی بارے اُن کو بلا کر بٹھایا جاتا ہے اور یہی کہ دونوں صاحب مل کر صلاح کیا کرتے ہیں۔ اور ہماری اماں صاحب بھی یہی کہتی ہیں کہ نکاح جلد ہو جائے تو اچھا ہے۔ آپ اس کا ذکر نہ کیجئے گا نہیں تو ماموں جان مجھے گھر سے نکالدیں گے اور کہیں گے تو بڑا ہی بھانڈا پھوڑتا ہے۔

اس قصے کو سنکر امۃ کے ہوش اُڑ گئے اور اُس کا دل دھڑکنے لگا اور سمجھی کہ عاشق حسین کو اسی غرض سے بار بار بُلا کر گھر میں بٹھایا جاتا ہے اور اُس دن منور علی کی ماں نے یہ فقرہ بھی میرے ہی سنانے کو کہا تھا۔ بھائی عاشق کہتے ہیں کہ کنواری لڑکی بہ کچھ کسی طرح نہیں ہے اگر شکل شکل سے درست اور خوش سلیقہ رانڈ مل جائے گی تو میں بڑے چاؤ سے نکاح کر لونگا۔ کیونکہ ہمارے حضرت نے بھی رانڈوں سے نکاح کیا ہے۔ امۃ نے سمجھ لیا کہ لڑکا منور علی احمق ہے یقین ہے کہ میرا کام اسی کی ہی سے نکل جائے اس واسطے اُس سے چکنی چپڑی باتیں شروع کیں

امۃ۔ منور علی بھئی تم نے بڑا ثواب لیا جو مجھ سے یہ بھید کہدیا خدا کرے تمہارا سونے کے سہرے سے بیاہ ہو اور گوری چاند سی دلہن آئے ایک کا یہ ثواب اور یہ ہے جو کر دو تو میں تمہاری لونڈی ہو جاؤں۔

منور علی۔ ممانی جان آپ کیا فرماتی ہیں۔ میں تو آپ کا چھوٹا ہوں۔ آپ فرمائیے کیا کام ہے
امۃ۔ قسم کھاؤ کہ میرا کسی سے کہنے کا نہیں۔

منور علی۔ خدا جانتا ہے میں کسی سے نہیں کہنے کا

امتہ۔ اچھا تو چپکے سے ایک خط میری طرف سے ابا جان کے نام دلی اس مضمون کا لکھ بھیجو کہ یہاں لوگوں نے مجھے اکثر بہت تنگ کیا ہے اور یہاں میرا ناک میں دم ہو رہا ہے آپ خط دیکھتے ہی منجھلے بھائی کو بھیج دیجئے تاکہ وہ مجھے لیجائیں اور مجھے نہیں معلوم اس خط کے پہنچتے پہنچتے یہ لوگ مجھ پر کیا ظلم کر گزریں بھائی کو فوراً بھیجئے

منور علی۔ بھائی جان یہ کونسی بڑی بات ہے لیجئے میں ابھی لکھے دیتا ہوں اور فی الواقع اس نے مجھ بھر میں امتہ کے باپ کو اسی مضمون کا خط لکھا اور امتہ کو سنا ڈاکخانہ میں ڈال آیا اور امتہ سے آکر کہدیا کہ خط آپ کا دلی گیا۔

خط بھیجنے سے امتہ کے دل کو کسی قدر تسلی ہوئی مگر جب اس کو یہ خیال آتا تھا کہ اگر ان لوگوں نے خط کے پہنچنے اور بھائی کے آنے سے پہلے زبردستی میرا نکاح کر دیا تو میں کیا کرونگی۔ اور میرا بھائی کون ایسا سگا بیٹا ہے جو میرا ساتھی ہوگا، تو اس بیچاری کا کلیجہ کانپ جاتا تھا اور آنکھوں سے آنسوؤں کے بدلے خون ٹپک جاتا تھا کبھی آپ ہی آپ کہتی کہ منور علی لڑکا تو ہی ہی کیا عجب ہے جو اس نے اسے دل سے تراش کر یہ قصہ کہدیا ہو مگر منور کا کہنا جھوٹا نہ تھا کیونکہ قاضی جی کے اشارے سے امتہ کی نند نے ایک دن امتہ کے منہ پر کہہ ہی دیا کہ بہن بی شرع کی بات برا ماننے کی نہیں ہوتی۔ بھائی کی اور میری اور ہمارے سارے کنبے کی یہ رائے ہے کہ تمہارا نکاح بھائی عاشق حسین سے کر دیا جائے۔ وہ کوئی غیر نہیں دوسرے خوشحال ہیں اور بڑی تماشے کرتے ہیں اس لئے رکھیں گے بھی خوش۔ ہاں عمر کی کہو تو کہ دو لگے پچاس برس کی ہے۔ سو یہ مثل مشہور ہے کہ مرد ساٹھا سو پاٹھا۔ اور عورت بیسی سو کھیسی۔

امتہ کو نند کی اس گفتگو پر غصہ تو بہت آیا مگر اس نے اپنے تئیں سنبھالا اور یوں جواب دیا۔

امتہ۔ نہیں آپا شرع شریعت سر آنکھوں پر اس سے کون منکر ہو سکتا ہے مگر اندھیر اندھیر سب برابر۔ آپ بھائی عاشق حسین سے نکاح کر لیجئے تو بہت مناسب ہو۔ ایک تو وہ اور آپ دونوں ہم عمر۔ دوسرے ایک ہی خاندان کے آپ ان کے دل کے موافق ان کا گھر کر دینگی اور میں تو ناتجربہ کار لڑکی۔ ان کی نواسی کے برابر بھلا مجھ میں اتنی لیاقت کہاں کہ

اُن کے گھر کو جاکر یار چاند لگاؤں گی

ہائے تم کیسی نا سمجھ ہو ابھی میرے بھائی کا کفن بھی میلا نہیں ہوا جو اس کی رانڈ بیوی
کا نکاح بھی کروانے لگیں خدا کو کیا منہ دکھاؤ گی۔

شمشاد۔ میرے ہوتے بھائی کا طعنہ دیتی ہو تو جو ہمارے دامن کو لگے گی وہ تمہارے دلکو
بھی یہیں لگ سکتی۔ اور سب نکاح کی جو کہتی ہو اب میں کیا نکاح کرونگی سر میں سفیدی
آگئی دانت ہلنے لگے۔ جب نکاح کا وقت تھا اپ بھائی صاحب نے مجھ سے کہا تھا میں نے انکار کردیا
میراجی نہ چاہا۔

امتہ۔ جس طرح آپ کا جی نہ چاہا ایسے ہی میرا جی نہیں چاہا اور میں بھی انکار کرتی ہوں
آپ لوگوں نے کہہ سن کر حق ادا کرلیا۔

شمشاد۔ تو وہ وقت لد گئے اب انکار نہیں چل سکتا۔ تمہارا نکاح ہوا اور ضرور ہوا۔

امتہ۔ زبردستی؟

شمشاد۔ ہاں زبردستی۔

امتہ۔ یہ کیونکر؟

شمشاد۔ یہ یوں کہ سرکار کا قانون آگیا ہے کہ ہندوستان میں رانڈیں بہت ہیں اور وہاں
کی گھر کی رسم کی وجہ سے وہ انکار کرتی ہیں۔ مگر اُن کا انکار ہرگز ہرگز نہ سنا جائے اور اُنکے
وارث اُن کا زبردستی نکاح کردیں۔

امتہ۔ جھوٹ ایسا ہوتا تو پہلے ہماری دلی میں آتا۔ اس لئے کیا جتہ کہ گاؤں
گنوییں میں تو قانون آجائے اور دلی میں نہ آئے۔ مگر یہ کہئے کہ ہماری بوڑھی منڈیاں اسلئے
ہیں کہ آمنہ پانچ ہزار کے مہر کا دعویٰ نہ کرنے پائے۔ مگر میں دعویٰ کہیں جدا نہ چاہا تو قرقی
کی طناب تلے پانچ ہزار لے لوں گی۔ اور مجھے بھی دیکھنا ہے کہ زبردستی میرا نکاح
کون کرے گا۔

شمشاد۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ بھائی عاشق حسین کل ہی واسطے بلند سہرے بار کے
ہیں کہ چوڑیاں عطر مسی چھوہارے مٹھائی نکاح کا سامان لے آئیں۔ کل آنکلے تو پھول

جمعرات کو اور پرسوں آ گئے تو اترسوں جمعہ کو نکاح ہو جائے گا۔ اور شاید آٹھے ہی لدا کرتے ہیں۔

اُمتہ۔ اوہ جمعرات اور جمعہ تو بہت دُور ہے دیکھئے تو خدا کیا کرتا ہے اور یہ کہکر وہ کوٹھے پر چلی گئی اور وہاں اپنی بے کسی اور تنہائی پر ہچکیاں مار مار کر رونے لگی مگر اُس غریب لڑکی کا وہاں کون بیٹھا تھا جو اُسے تسلی دیتا اور جی بہلاتا۔ امتہ سدے کو دو رو کر آئی تھی مگر جمعرات اور جمعہ کے تصور سے اُس کو ہول اُٹھتا تھا۔ اور کہتی تھی الٰہی اس کمبخت حکیم اور بدنصیب ننھے زبردستی ایک نامحرم کے ہاتھ حوالہ کر دیا تو میں کیا کروں گی اور ننگ و ناموس کیونکر بچیگا۔ منور علی سے خط لکھوا کر جو ڈلوایا تھا اُس کو گئے ہوئے آج پورے آٹھ دن ہو گئے تھے اس لئے اُسے مایوسی ہو گئی تھی اور اُس نے سمجھ لیا تھا کہ منور علی نے خط ڈاک میں ڈالا نہیں ورنہ اُس خط کو پڑھکر ابا بھائی رفیع کو ضرور بھیج دیتے۔ مگر نہیں یہ خیال اُس کا غلط تھا۔ منور نے ڈاک میں خط ضرور ڈالا۔ اور وہاں پہنچا بھی مگر وزیرن بدحواس نے چٹھی رسان سے خط لے باورچی خانہ کے طاق میں رکھ دیا اور حافظ صاحب کو دینا بھول گئی چھ دن بعد جو اُس نے کسی ضرورت سے طاق میں ہاتھ ڈالا تو وہ خط اُسکے ہاتھ میں آ گیا۔ اور اُس نے لا کر حافظ صاحب کو دیدیا۔ چھ دن تک جو باورچی خانہ کے طاق میں پڑا رہا تھا اس واسطے دھوئیں کا سرخ رنگ اُسپر چڑھ گیا تھا۔ اور وہ بہت بُرا معلوم ہوتا تھا۔ اس واسطے حافظ نے کہا وزیرن کب کا پُرانا خط اُٹھا لائی۔

وزیرن۔ نہیں میاں خط تو نیا ہے مگر میرے حواسوں پر خدا کی مار ہے آپ کو دینا بھول گئی تھی اب یہ جمعرات کا دن اور صبح کے سات بجے ہیں حافظ صاحب نے خط پڑھا اور کہا وزیرن غضب کیا ایسا ضروری خط اور تو نے چھ دن ڈال رکھا۔ اچھا باہر سے رفیع کو تو بلا لا۔ چنانچہ رفیع احمد آ گئے باپ بیٹوں میں چپکے چپکے کچھ باتیں ہوئیں اور رفیع گلے میں بیگ ڈال سیدھا اسٹیشن پر پہنچا اور ریل میں سوار ہو کر سیدھا بلند شہر روانہ ہوا۔
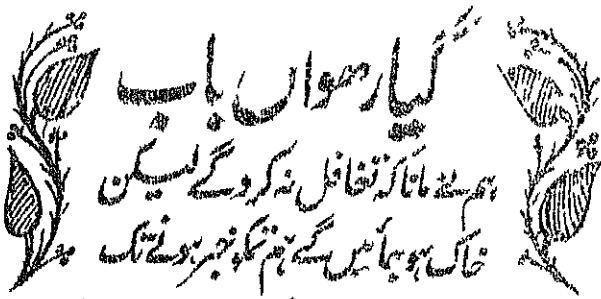
رفیع بھولے کے اسٹیشن پر ریل سے اترا اور یکہ گاڑی میں سوار ہو کر گیارہ بجے دن کے بلند شہر پہنچ گیا۔ مگر بلند شہر پہنچ کر اس کو یہ تشویش لاحق ہوئی کہ احمد آباد جانے کے واسطے کوئی سواری اس کو نہ ملی تھی اور وہ بازار میں حیران کھڑا تھا اور ہر ایک سے سواری کے لئے کہہ رہا تھا کہ کسی شخص نے اس کو بتلایا کہ شفاخانے کے آگے جو سڑک ہے اس پر کرایہ کی سواریاں کھڑی ہوا کرتی ہیں۔ آپ وہاں چلے جائیے کچھ عجب نہیں جو کوئی یکہ وکہ [illegible] آپ کو مل جائے۔ رفیع چلا اور شفاخانہ پہنچ گیا مگر سڑک اس کی بالکل خالی تھی۔ اور کوئی سواری وہاں نہ تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ جائے۔ اور آرام لے مگر اس نے دیکھا کہ ایک دو پہیہ آیا اور شفاخانہ کے دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا مگر رفیع نے اس جا کر دیکھا تو سارا دو پہیہ اسباب سے بھرا ہوا تھا اور اس پر ایک دبلا پتلا نوجوان آدمی بیٹھا تھا جو اسے ہانکتا تھا۔

رفیع (دو پہیہ والے سے) تمہارا دو پہیہ کرایہ کا ہے

دو پہیہ والا۔ جی ہے تو کرایہ کا مگر رکا ہوا ہے میں احمد آباد جا رہا ہوں۔

رفیع۔ ہم بھی احمد آباد ہی جانا چاہتے ہیں لے چلو گے۔

دو پہیہ والا۔ اندر تو جگہ نہیں ہے کاجی۔ یہ اسباب بھرا ہوا ہے اور پھر وہ بھی بیٹھیں گے پیچھے آپ بیٹھنا چاہیں تو میں لیے چلوں گا۔ رفیع قاضی جی کا نام سن کر چونکا اور اس نے اپنے دل میں کہا شاید قاضی انوار حسین ہوں گے۔ کیونکہ احمد آباد میں سوائے ان کے یا ان کے عزیزوں کے اور کوئی قاضی نہیں کہلاتا ہے اس لئے اس نے دو پہیہ والے سے کہا قاضی جی کون ہیں؟

عاشق حسین۔ یہ یوں باتیں ہوئیں۔
رفیع (پان ڈبیہ میں سے نکال کر) لیجئے جناب پان کھائیے۔
عاشق حسین۔ (پان لیکر) تسلیم ذرا سا تمباکو اور عنایت کیجئے۔
رفیع احمد۔ زردہ تو میں کھاتا نہیں ہوں۔ اس لئے میرے پاس بھی نہیں ہے۔
عاشق حسین۔ ہیں یہ زردہ کیسا۔ کیا آپ دہلی رہتے ہیں
رفیع۔ دہلی میرا وطن تو نہیں ہے مگر کچھ دنوں انگریزی تعلیم کے واسطے جو وہاں رہنے کا
اتفاق ہوا تو بعض لفظ شہر کے زبان پر چڑھ گئے ہیں۔ فریدآباد میں بھی لوگ ایسے
ہی بولا کرتے ہیں۔
عاشق حسین۔ نہیں ہنسی کی کیا بات ہے۔ دہلی کی زبان تو ہندوستان کی ساری زبانوں
کی بادشاہ ہے اور مجھے تو دہلی کی زبان بہت ہی پسند ہے اور خصوصاً وہاں کی عورتوں کی تو وہ
دلفریب زبان ہے کہ باہر کا آدمی سنکر کلیجہ ہی تھام لیتا ہے۔ اور یوں بھی ہم تو دلی پر جی جان سے
فدا ہو چکے ہیں۔
رفیع۔ آپ کا کوئی دلی سے تعلق ہوگا۔
عاشق حسین۔ تعلق ہی تو نہیں مگر خدا چاہے تو آج رات کو دلی سے میرا تعلق ہو جائیگا۔
دیکھئے یہ سارا سامان اسی تعلق کے واسطے لئے جاتا ہوں۔
رفیع احمد۔ یہ تو میری سمجھ میں نہیں آیا۔
عاشق حسین۔ میرا سچا قصہ جو ہے وہ سچا حال ہے وہ میں آپ سے کہے دیتا ہوں
اصل یہ ہے کہ میرا چچا زاد بھائی دہلی میں رہا تھا۔ شہر والے ہوشیار تو ہوتے ہی ہیں اس کے
سسرال نے پانچ ہزار کا مہر اسٹامپ پر لکھوا لیا تھا۔ پانچواں مہینہ ہے کہ وہ مر گیا۔
اب اس کی بیٹی بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کے بیٹے کو جو میرے بھائی ہوتے ہیں اندیشہ ہوا کہ
کہیں مہر کا دعویٰ نہ کر بیٹھے نہیں تو رہنے کا گھر تک نیلام کروا دے گی۔ اس واسطے
انہوں نے یہ فکر کی کہ اپنے ہی کنبہ میں اس بانڈ کا نکاح کر دیا جائے۔ تاکہ اس کو نالش کا
حوصلہ نہ ہو۔ اتفاقیہ پرسوں ذکر چھڑ گیا تھا۔ سمدھی کے بھائی سے بڑی تذکرہ کیا۔ کیونکہ

میری بیوی کو مرے چھ برس ہوئے تھے مجھے شادی کا خود خیال بھائی کے کہنے سے
میری سمجھ میں یہ آیا کہ لاؤ میں ہی ان کی بھاوج سے نکاح کر لوں ۔ دہلی کی عورت ہے۔
صورت کی اچھی نہ ہوگی تو تمیزدار اور سلیقہ شعار تو ضرور ہوگی ۔ چنانچہ میں نے درپردہ
مسماۃ کی شکل و صورت اور چال چلن کی چھان بین کی تو معلوم ہوا صورت سیرت
دونوں کی اچھی ہے میں لٹو ہو گیا اور بھائی سے کہا سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے اپنی
بھاوج کا نکاح مجھ سے کر دیجئے ان کو تو اپنی بلا سر سے ٹالنی تھی وہ فوراً راضی ہو گئے۔
میں نے کہا تو اچھا اب مسماۃ کے کان میں بھی یہ بات ڈال دینی چاہئے کیونکہ بالغ عاقلہ
اور بیوہ ہے مگر بھائی نے کہا ہرگز نہیں وہ عورت سخت بد مزاج اور غصیلی ہے اور وہ
گاؤں والوں سے دلی نفرت رکھتی ہے اسی وجہ سے وہ اپنے میاں کو کبھی خاطر میں
نہیں لائی اور اسے جلا جلا کے مار ڈالا ۔ اگر کہیں اس نے سن لیا تو ہمارے تمہارے نتھنوں
میں تیر چلا دیگی ۔ میں تو عین وقت پر اس سے کہونگا تاکہ اسے چیل پھیرنے کا موقع زیادہ
نہ ملے ۔ گھنٹہ دو گھنٹہ رو پیٹ کر آپ ٹھنڈی ہو جائے گی ورنہ میں زبردستی نکاح کر دونگا ۔
کیونکہ قاضی تو سارے قصبے کا میں ہی ہوں ۔ اب بھائی اس کے دہلی بیٹھے ہیں اس کی
فریاد قصبہ میں سن کون سکتا ہے ۔ اور نکاح کے بعد دہلی والوں کو خبر ہوئی تو کر کیا سکتے
ہیں چنانچہ خدا کو منظور ہے تو آج اسی کو میرا نکاح ہو جائیگا اور مجھے بھی اپنی زوجہ
کی وجہ سے دہلی کے ساتھ ایک تعلق پیدا ہو جائے گا ۔ کہئے اب تو آپ کی سمجھ میں یہ
معمہ آگیا ۔ اس قصہ کو سن کر رفیع احمد کی آنکھوں میں مارے غصہ کے خون اتر آیا کیونکہ
وہی شکیل تو وہ جوان ہے جس نے برات والے دن قاضی اور آپ سب کے خشنے ٹھیک کر دیئے
تھے اور خورشید حسین کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا تھا ۔ مگر اس وقت اس نے بڑے
ضبط سے کام لیا ۔ اور ہنس کر کہا آپ نے عجیب داستان سنائی میں اس معمہ کے حل کو
ترس گیا ۔ خدا انجام بخیر کرے ' اس کتاب کے ناظرین کو حیرت ہوگی کہ ایسے نازک
راز کو عاشق حسین جیسے تجربہ کار شخص نے جو سرحد نیپال پر سالہا سال گورنمنٹ کا نوکر
رہا ہو راہ چلتے مسافر سے کیونکر کہہ دیا ہوگا ۔ مگر حضرات حیرت کی کچھ بات نہیں ہے ہمارے

قاضی عاشق حسین صاحب کو بے ہوشی کا بھی شوق تھا اور شراب کی اور سینکڑوں برائیوں میں سے
ایک بھاری برائی یہ ہے کہ اس کے نشہ میں انسان سارے بھید اور سارے راز اگل دیتا ہے
چنانچہ آج بھی انہوں نے بلند شہر کے شراب خانہ میں جاکر حد سے زیادہ پی تھی اور انکو
اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ اور رفیع کے سامنے وہ بے تکلف بکنے لگے اور جو کہنا
تھا وہ کہہ گذرے۔ اور اپنے پاؤں میں انہوں نے آپ کلہاڑی مارلی۔

بارھواں باب

جی کی جی میں ہی رہی بات نہ ہونے پائی
ایک بھی اُن سے ملاقات نہ ہونے پائی
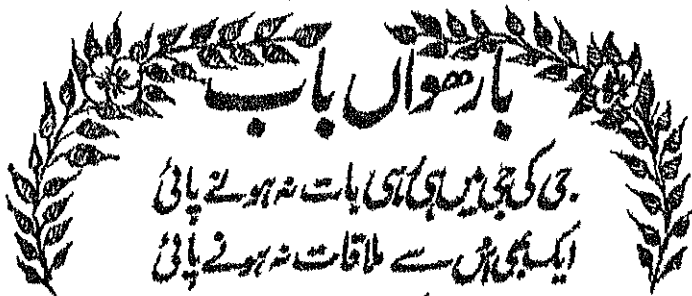
شام ہو چلی ہے اور رات کی تاریکی کسی بیمار ہجر کی سیاہ بختی کی طرح ہر آن زیادہ ہو رہی ہے
اور چونکہ جمعہ کی شام ہے۔ اس واسطے آمنہ کے دم پر بن رہی ہے اور اس کا کلیجہ بلیوں
اچھل رہا ہے اور اسے یقین ہو گیا ہے کہ آج خبیث بے رحم دنیا کی طمع سے میری ننگ و ناموس
کو ضرور ایک نامحرم کے ہاتھ سے برباد کرا دے گا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ اور
زبان پر یا اللہ یا مشکل کشا ہے۔ خدا کی درگاہ میں سچے دل سے دعائیں مانگ رہی ہے۔
ناگاہ قاضی جی باہر سے ہنستے ہوئے گھر میں آئے اور بیوی سے کہنے لگے "تم کہتی
تھیں بھائی عاشق حسین بلند شہر جاکر بیٹھ رہے لیجئے وہ آگئے ابھی دروازہ پر دو پہیہ
ان کا آکر کھڑا ہوا ہے اور اس میں سے اترے بھی نہیں تھے کہ میں تم سے کہنے چلا آیا ہوں۔
اسے ان سے کہو رو دھو لے تو ہو لیا۔ آمنہ جی اٹھیں اور نہا دھو لیں نکاح میں کچھ دیر
نہیں ہے" قاضی جی یہ بات گویا ایک تیر جگر دوز تھا جو آمنہ کے کلیجے کے پار ہو گیا اور ڈر کے مارے
اس کے ہاتھ پاؤں میں سنسنیاں آنے لگیں اور قریب تھا کہ اس کا دم نکل جائے۔ مگر
اسی آن میں منور علی بھی قاضی جی کے پیچھے پیچھے دوڑ کر گھر میں آیا۔ اور اس نے کہا بھائی عاشق
بلند شہر سے آگئے اور ان کے ساتھ بھائی خاں کے بھائی رفیع بھی وہاں سے آئے ہیں پر وہ کہتے۔

جس طرح قاضی صاحب کے اوپر واپس چلے سے اُن کا دل دہلا دیا تھا اسی طرح منور کے اس فقرہ نے قاضی جی کے حواس کھو دیئے۔ اور وہ رفیع کا نام سن کر گھبرا گئے اور اُن کی ہمت فوراً اتنی ساقط ہو گئی کہ گھر سے باہر جانا دوبھر ہو گیا۔ وہ تو سٹپٹاتے ہی رہے اور رفیع ڈیوڑھی میں آ گیا اور اُس نے للکار کر کہا "بی آپا پردہ ہے۔ گھر میں آ جاؤں"۔ اللہ اکبر انیس کیلئے یہ صدا وہ صدا تھی جس سے مسیح علیہ السلام مُردے زندہ کیا کرتے تھے۔ اُسے تاب نہ ہوئی اور وہ دیوانہ وار ڈیوڑھی کی طرف بھاگی۔ ادھر سے رفیع دوڑا اور دونوں بھائی بہن گلے مل کے رونے لگے۔ اور قاضی جی موقع پا کر دبے پاؤں باہر چلے گئے۔ جب انیس دل کھول کر رو چکی اور اُس کا کلیجہ بھائی کو دیکھ کر ٹھنڈا ہو چکا تو اُس نے چاہا کہ قاضی جی جو اس پر ظلم ڈھانا چاہتے تھے رفیع کے آگے بیان کرے۔ مگر رفیع نے کہا آپا جان آپ کے کہنے کی کچھ حاجت نہیں ہے۔ خدا نے اپنی قدرت سے رستہ ہی میں مجھے یہ سارا قصہ قاضی عاشق حسین کی زبان سے بغیر میرے بلا پوچھے سنوا دیا ہے۔ اور رفیع نے جو کچھ قاضی عاشق حسین سے گاڑی میں سنا تھا سب اپنی بہن کو سنا دیا اور اُس کی تشفی کی اور کہا گھبرانے کی کچھ بات نہیں ہے۔ خدا انگریزی گورنمنٹ کے اقبال کو دن دونا اور رات سوایا کرے اس عہد میں شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں اور اُس نے اپنی بیکس اور غریب رعایا کی فریاد اور دادرسی کے واسطے قصبہ قصبہ اور گاؤں گاؤں میں تھانے اور کوتوالیاں بنا دی ہیں۔ میں تھانہ میں جا کر ابھی رپورٹ کئے دیتا ہوں انسپکٹر پھر دیکھئے کیا تماشہ ہوتا ہے ابھی سارا تھانہ تمہارے پاس دوڑا چلا آئیگا۔ اور دونوں صاحبوں کو اس ظلم کی حقیقت کھل جائے گی۔ ایک تو رفیع یہ باتیں چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ دوسرے قاضی انوار حسین ڈیوڑھی میں آ کھڑے ہوئے تھے۔ اس لئے رفیع کی گفتگو سن کر دونوں کے ہوش پراں ہوئے اور چپکے چپکے آپس میں یوں باتیں کرنے لگے۔

عاشق حسین۔ اللہ رے دلی لونڈا بھی وہاں کا رہر کا بنا ہوا ہے کیسی ضابطہ اور قانون کی بات کہہ رہا ہے۔

قاضی انوار حسین۔ اے بھائی کچھ نہ پوچھئے یہ لونڈا بڑا حرامزادہ ہے خورشید حسین کو

انکی سوجھی ہے

سردار دلہن۔ نہیں آپ بھی تو وہ اپنے بیاہ کا کچھ ذکر نہیں مجھ سے کرتے تھے

اصغر علی۔ کیا ذکر کرتے تھے

سردار دلہن۔ یہ کہتے تھے دیکھو بھائی جان میں کوئی ابھی کا نہیں ہوں آبا جان کے مرنے کے بعد ہمارے آبا جان نے ایک بچے کے سر پر ہاتھ رکھا اور چھ مشوروں میں سے ایک کا بھی بیاہ نہ کیا اور کیا تو اس بڑھاپے میں اپنا ہی کیا۔ جس دن سے آبا جان کا انتقال ہوا بھائی محمد علی تو یہاں آکر چھا گئے تک ہیں بڑے بھائی نے اپنا بیاہ آپ کر لیا کیونکہ خدا رکھے وہ ٹھیرے مولوی فاضل ہر کسی سے قبضہ کر لیے ہیں ماموں جان نے اپنی بڑی بیٹی انہیں بیاہ دی تھی۔ یہاں کی یہ ہے کہ سوئی برس دن کے اندر ہی لڑکیاں اور وہ رنڈوے ہو گئے۔ اب وہ پھر کہیں کر لیں گے کیونکہ وہ ارکے تیس روپے بیٹھے کماتے ہیں مجھ غریب کی خرابی ہے نہ کوئی کسے میں بیٹی دے نہ باہر کہیں سے بات آئے کیونکہ خالی ہڈی کو کتا بھی نہیں سونگھتا۔ مگر اب میرا بھی ارادہ ہے کہ اپنا بیاہ آپ کر لوں، اگر سید محمد کے کان میں اتنی بات پڑ جائے تو وہ جی جان سے راضی ہو جائیں۔

اصغر علی۔ دیکھو میں آج ہی اُسے کہونگا اور رات ہی کو کسی ساتھ سے ملا کر۔ سردار دلہن نے سید محمد سے تذکرہ کیا اور سید محمد نکاح کے واسطے آمادہ ہو گیا۔ دوسرے روز میر امیر علی صاحب جو سید محمد کے باپ تھے اور سید محمد کے ماما صاحب اصغر علی سے یہ حال بیان کیا اور دونوں صاحبوں نے اپنی رضامندی ظاہر کی۔ میر امیر علی نے کہا جس دن سے شمس بیگم کا انتقال ہوا میرا گھر اُجڑ گیا اور مجھے قسم قسم کی بے آرامی ہو گئی۔ رفیع النسا چھوٹی بچی ہے کہاں تک اُسے گود میں چڑھائے چڑھائے پھروں۔ بہو گھر میں آ جائے تو مجھے ہر طرح آرام ملیگا۔ سید محمد کا نکاح کل کا ہوتا آج ہو جائے۔ اسی طرح سید محمد کے تمام خاندان نے اس بات کو دل سے پسند کیا اور اصغر علی نے سید محمد کے حسب نسب کا رقعہ جیسا کہ دہلی میں دستور ہے حافظ صاحب کے پاس بھیج دیا اور حافظ صاحب نے منظور کر لیا بات پکی ہو گئی اور نکاح کی تاریخ مقرر ہو گئی۔

جو ایک کنواری دلہن کی ہوا کرتی ہے مگر اس کے خلاف اُمتہ کی بڑی خاطر تواضع ہوئی
اور محلے بھر سے بھی کسی بڑی چھوٹی نے اس کا ذکر نہ کیا اور اُس کی چاند سی صورت کے
سب فریفتہ ہو گئے اس کی شیریں زبانی اور سلیقہ سے وہ کام کیا جو سونے میں سہاگہ
اور موتیوں میں دھاگا کرتا ہے ۔ امتہ گو دہلی سے نواب گنج چلی آئی مگر اُس کو یہ معلوم نہ
ہوا کہ میں باہر شہر یا کسی قصبہ میں آگئی ہوں ۔ کیونکہ ایک تو اُس کی چھوٹی بہن سردار دلہن
نواب گنج میں رہتی تھی اور سوائے اس کے سید محمد کے ماما مالی ماموں ممانی خالہ خالو
وغیرہ وغیرہ دہلی والے موجود تھے اور جس گھر میں یہ جا کر اُتری چاروں طرف انہیں
لوگوں کے مکان تھے ۔ اس واسطے ہر وقت ہر جا سے وہی محاورہ اور وہی صدائیں
اس کے کان میں پڑتی تھیں جس کی ہمیشہ عادی تھی اور امتہ کا دل بھی ایسا الگ کیا
تھا جس کی ہرگز امید نہ تھی ۔ سید محمد حوصلے سے بڑھکر اپنی بیوی کی دلجوئی کرتا تھا اور دل
جی جان سے اُس پر فدا تھا ۔ اور وہ بھی اُس کو چاہنے لگی تھی ۔ مگر کبھی کبھی بے اختیار
اُس کے منہ سے ایک آہ نکل جاتی تھی اور وہ ایسا لمبا اور ٹھنڈا سانس لیتی تھی جس سے
پاس بیٹھنے والے سمجھ جاتے تھے کہ مرے ہوئے میاں کا تصور ابھی اس کو باقی ہے اور غم
کا کانٹا اُس کے کلیجہ میں کھٹکتا ہے ۔ حمیدہ کو وہ سر پٹے کا مرا اور منہ کی مٹی کی نشانی
کہا کرتی تھی ۔ اور حد سے زیادہ چاہتی تھی ۔ سید محمد سے کچھ دنوں تو حمیدہ اوپرائی تھی
آخر کار وہ اُس کا دم بھرنے لگی ۔ اور اُس سے مل گئی ۔ کیونکہ سید محمد اپنی بیوی کی خاطر
اسکے ساتھ ایسی محبت کرتی جیسی وہ اپنی سگی بیٹی کے ساتھ کرتا ۔ اور خاصکر اُس دن سے
حمیدہ کا خیال سید محمد کو اور ہو گیا جس دن سے سید سلیمان اُس کا بڑا بھائی
پشاور سے آیا ۔ اور اُس نے ایک اشرفی امتہ کو منہ دکھائی میں دی اور ایک اشرفی حمیدہ
کو دی اور کہا مجھے آج حمیدہ کو دیکھکر ایسی ہی خوشی ہوئی ہے جیسی مجھے محمد کی سگی بچی کو
دیکھکر ہو سکتی ہے سید محمد کو لازم ہے کہ اس لڑکی کے کھلانے پلانے میں دریغ نہ کرے

سے سجھا ناممکن ہے لاؤ کوئی ایسا کام کر جاؤں جس سے دنیا میں نام اور عاقبت میں کام ہو
چنانچہ مرنے سے پہلے انہوں نے ایک بکس منگایا اور اُس میں سے کئی ہزار کے نوٹ
نکال کر مولوی چشتی صاحب اپنے استاد کو دیئے اور کہا مولانا یہ رقم اس واسطے آپکو دی
ہے کہ آپ کسی نیک اور مناسب کام میں لگا دیں شاید اسی ذریعہ سے میری نجات
ہو جائے۔ غیر ان کا انتقال ہو گیا اور مولوی چشتی صاحب نے جو اپنے وقت کے جنید
اور شبلی ہیں اُس روپیہ سے ایک جائداد خرید لی اور اُس کی سالانہ آمدنی میں سے
ایک مدرسہ جاری کیا جس میں قرآن اور نماز روزہ کے مسائل پڑھائے جاتے ہیں۔
سب سے پہلے اُس مدرسہ میں خدا دوست نام ایک مدرس مقرر ہوا اور کئی برس وہ مدرسہ
پڑھاتا رہا مگر آخر بعض لوگوں نے مولانا کو سمجھایا کہ یہ بچوں کو اچھی طرح تعلیم نہیں دیتا۔
اس لئے اس کو برطرف کر کے مولوی رہنما حسین صاحب کو مقرر کروا دیا۔ وہ بھی کئی برس
رہے مگر مولانا کو اُن کی طرز تعلیم بھی پسند نہ آئی۔ اس واسطے تیسرے مدرس کی تلاش ہوئی
اور ہمارے بڑے ماموں جان کے کان میں بھنک پڑ گئی اور انہوں نے مولانا سے کہا ایک
لائق استاد میری نظر میں ہیں۔ اگر آپ فرمائیں تو میں ملا دوں۔ مولانا نے کہا ملا دو۔ ماموں
جان کی اور قاضی جی کی ملاقات تھی اور ماموں جان اور بیگم آپا دونوں قاضی جی کو مکتب
پڑھاتے بھی دیکھ چکے تھے اور اُن کی لیاقت کے بیحد [illegible] چکے تھے اس لئے انہوں نے
قاضی جی کو خط لکھ کر بلا لیا۔ اور آج انہیں یہاں مدرس ہوئے تین دن ہو گئے۔ موذن
کہتا تھا کہ میر صاحب قاضی جی جس دن سے یہاں آئے ہیں کئی شخصوں سے پوچھ چکے ہیں
کہ سید محمد یہاں کوئی صاحب ہیں جن کی شادی دہلی ہوئی ہے مگر اُن کو کسی نے ٹھیک پتہ
نہ بتایا آج انہوں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا میں خوب جانتا ہوں اور حضرت کی
سرکار میں وہ مسجد میں آئینگے تو میں آپ کو ملا دونگا۔ چنانچہ میں جو اس وقت مسجد میں نماز
پڑھنے گیا تو نمازی موذن نے قاضی جی کو مجھ سے ملایا اور یہ سارا حال کہا بیچارے بڑے
تپاک سے ملے اور بڑی دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ اپنی لڑکی کی شادی کا قصہ
اور اُس کے بعد لڑکی کا حال رو رو کر بیان کیا اور کہنے لگے ہم نے سنا ہے کہ جہاد میں [illegible]
نکل گئے [illegible] رسول [illegible]

میری طرف سے اپنے گھر میں سلام کہا اور یہ کہہ دیا کہ میرا روزگار اورنگ آباد میں اچھا خاصہ
لگا ہوا تھا جب میں نے سنا کہ تم اور حمیدہ نواب گنج آ گئے تو میں نے تمہاری محبت کے کارن
اس پر خاک ڈالی اور یہاں چلا آیا تمہاری سعادت مندی سے یقین ہے کہ تم بھی میری
اس محبت کی قدر کرو گے۔ اور مجھے امید ایسا ہی بڑا خیال کرو گی جیسا کہ خورشید کی
زندگی میں کرتی رہی ہو۔ اور حمیدہ کو بھی کبھی میرے پاس بھیج دیا کرو گی تاکہ میں اپنے مرے ہوئے
بھائی کی نشانی کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر لیا کروں۔

امتہ۔ قربان اس نہی اور طول کلامی کے بھلا اتنے ہیر پھیر سے کیوں بات کہی کہ مدرس ہیں
اور استاد ہیں اور یہ ہوا اور وہ ہوا۔ سیدھی طرح کیوں نہ کہہ دیا کہ تمہارے جیٹھ یہاں
مدرس ہو کر آئے ہیں اور تمہیں پوچھتے ہیں مگر بعض آدمیوں کی عادت ہوتی ہے کہ
بات کو بڑھا کر اور پھیر میں ڈال کر کہا کرتے ہیں۔ خیر یہ تو جو کچھ ہوا وہ ہوا مگر مجھے ان کے یہاں
آنے اور نوکر ہونے سے ایک اندیشہ ہو گیا ہے کیونکہ یہ آدمی ہیں بد باطن اور حاسد اور
اگلی باتوں کا غبار ان کے دل میں بھرا ہوا ہے اور میرے نکاح کرنے کا بہت خار ہے۔
ایسا نہ ہو موقع سمجھ کر بدلہ لیں۔ اور دشمنی میں پڑ جائیں۔

سید محمد۔ تم بھی کیا باتیں کرتی ہو ہم سے ان سے واسطہ ہی کیا۔ اور وہ تو بڑے
نیک آدمی ہیں ایسا خیال بھی ان کی طرف سے نہ کرو۔

امتہ۔ تم نہیں جانتے ہو میرے جیٹھ ہیں میں ان حضرت کی خو بو سے واقف ہوں یہ آدمی
[illegible] ہیں اور منتر کے بچوں کو بیاد دیتے ہیں۔ تم تو کہتے ہو میں مرد ہوں
اور [illegible] آ بات کو سمجھ رہی تھی ہی نہیں۔ انہوں نے مجھے سلام کیوں کہلا بھیجا
یہ سلام بھی [illegible] طرح کی ملنشر ہے جب کسی کو شرمانا ہوتا ہے تو کہتے ہیں سلام وہ میری
چٹکیوں تلے یہ پیدا ہوئے تھے جو سلام کہلا بھیجا میں چھوٹی وہ بڑے۔ غرض یہ ہے کہ ہمارے
کلیجے میں پھپھولے ڈالے کہ گھر چھوڑ کر چلی آئی اور اب یہیں خوشی کر بیٹھی۔ تمہیں کیا خبر ہے
کئی دن ہوئے جب احمد آباد سے ایک عورت یہاں آئی تھی تو ان کے بھائی نے مجھے
کہلا بھیجا تھا کہ اس نکٹی سے کہہ دینا یہاں کیسی جیتی چھپا لی تھی۔ بڑے بول کا سر نیچا آسمان
کا تھوکا حلق میں آتا ہے۔ اب کیوں نکاح کیا۔ ہم نے کہا ہمارے بھائی سر سے پاؤں تک

کہ تو عاشق سے نکاح کرے مگر آیت مانی کیونکہ رنگ لکا ذرا مدہم تھا۔ دوسرے عمر زیادہ
تھی اب جونسا کہ مرد وا گورا اور رہ عمر کا تھوڑا ہے تو راضی ہو گئی تاکہ یہ اچھا ہے تو فلاح پائی
اور حصا کیا ہے آگے آئیگا۔ یہ اتیں نفرت کی ہیں تو کیا رعشت کی ہیں۔ تم اُن سے
خلا ملا نہ کریا اور الگ تھلگ رہا۔ ہاں حمیدہ اُن کی بھتیجی ہے اور وہ اس کے سچ مچ وارث
ہیں جب چاہا کریں ملوا لیا کریں۔ میں منع نہیں کرتی کیونکہ خدا کو منہ دکھلانا ہے ناخونوں
سے گوشت جدا نہیں کیا جاتا۔

سترہواں باب

قاضی انوار حسین صاحب کو نواب گنج میں مدرس ہوئے تین ماہ گذر گئے ہیں
اور اب اُن کی رسائی ریاست کے تمام آدمیوں سے ہو چلی ہے۔ حمیدہ ان کے پاس
آتی جاتی ہے اور وہ ان سے مانوس ہو چلی ہے۔ اور قاضی جی نے اپنی ہوشیاری
اور دانائی سے سید محمد کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور وہ انکے پاس گھنٹوں اٹھتا بیٹھتا ہے اور
اور خصوصیت یہاں تک ترقی کی ہے کہ وہ سید محمد کی رسائی ڈیوڑھی تک وقت بےوقت
چلے جاتے ہیں اور حمیدہ کو کبھی آم کبھی شیرینی دے آتے ہیں۔ اور چونکہ سید محمد کے
تمام خاندان کے آدمی نیک سیرت ہیں اس واسطے قاضی صاحب کی طرف سے کوئی بدگمانی
نہیں ہے اور اُن کے برابر دروازے پر آنے جانے کو برا نہیں جانتے ہیں اور انکی وحشت
بھی قاضی صاحب سے کم ہو چلی ہے اور جب قاضی صاحب حمیدہ کو بلاتے ہیں تو فوراً
بھیج دیتی ہے یا جب قاضی صاحب ڈیوڑھی پر آتے ہیں تو آداب کہلا بھیجتی ہے الغرض
قاضی صاحب نے جان لیا کہ میرا سکہ امتہ اور امتہ کے میاں کے دل پر بیٹھ چکا ہے اسلئے ہرونی
سہ اکتوبر کو سید محمد سے کہا کیوں جناب بچپن کا ملانا اور عہدہ یدہ در رسیدہ کا ٹھنڈا کر دینا
سید محمد۔ بہت اچھا بڑے ثواب کا کام ہے۔
قاضی صاحب۔ پھر آپ اس کار خیر میں کیوں حصہ نہیں لیتے۔
سید محمد۔ میں سمجھا نہیں۔
قاضی صاحب۔ جن سے آپکی بیوی حمیدہ کو احمد آباد سے لیکر چلی آئی ہیں۔

اس کی دونوں پھوپھیوں کو پھر اس کا دیکھنا نصیب نہ ہوا وہ اس کی جدائی میں بیقرار رہیں اور دن رات
لیتے اور اسکے مرے ہوئے باپ کو یاد کرکے زار زار روتی ہیں اگر آپ اجازت دیں تو میں حمیدہ کو آٹھ دن
کے واسطے احمد آباد دکھا دوں اور اسکی پھوپھیوں سے ملا لاؤں پھر آپکو سونپ دونگا

سید محمد - بہت اچھا کیا مضائقہ ہے مگر میں اس کی ماں سے پوچھ لوں

قاضی صاحب - پوچھنا کیا ہے اس کا استعفا تو بھیجنے پر راضی ہی کر دیجئے کیونکہ مجھے خیال ہے کہ حمیدہ کو
اتنی دور بھیجتے ڈرتی ہیں عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں اور آپکے گھر میں ہیں بھی سرہم ان کو سمجھا
پروا نہیں ہے کہ کوئی کسی کے واسطے کیا کرتا ہے اور ہمارے ہاتھ میں اس کا علاج ہے تو ہم دریغ
نہ کریں - سید محمد کا دل قاضی صاحب کی باتوں سے نرم ہو گیا اور اس نے جاکر امت سے کہا کہ
قاضی صاحب ایسا ایسا کہہ رہے ہیں

امت - یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ لڑکی انہیں کی ہے اور وہ اس کے ولی ہیں مگر میری مامتا تو
یہی کہتی ہے کہ میں حمیدہ کو ایک آن اپنی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دوں آٹھ دن میرے لئے تو آٹھ برس
اور آٹھ قرن ہیں اور جو میری بچی کو احمد آباد چھوڑ آئے تو میں کیا کرونگی

سید محمد - ایسا ہرگز نہیں کرسکتے ہیں اور اب دو چار آدمیوں کے سامنے ان سے اقرار کرالونگا
جب لڑکی کو بھیجونگا میں بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں۔

امت - خیر تم جانو جیسی دیگر حمیدہ کو میں تم سے لے بیٹھونگی

سید محمد - ہاں ہاں حمیدہ کو تم مجھ سے لے لینا امت کے کہنے سے احتیاطاً سید محمد نے چار پانچ آدمیوں
کے سامنے قاضی صاحب سے آٹھ دن کا وعدہ لے لیا اور حمیدہ کو ان کے ساتھ بھیجدیا۔
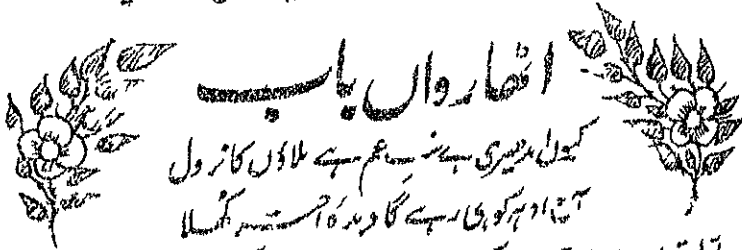
اٹھارواں باب

کیوں نہ میری ہے یہ غم ہے ملاؤں کا نزول
آتے ادھر کو ہی رہے گا دیدۂ اشتر کھلا

اول تو راستہ اور پھر آدمی پرایا بسنے کے اور وہ بھی ایسے ہی آئی تو سر آدمی کا اور کا رہا ہے تو
اس وقت بل ہو چکے - ورنہ بڑی آنکھیں کھولتے ہیں نہ بیان شہر ہوں یا جنگل کا دور ہاں
یا جنگل ادھر اور راستے ناسیاہی سے ہو کے ان سامان کر دیا ہے جس محفل میں اہل بار و کلر نگ

اُس کو نیند ہی بہت تھی یا چوروں کے ڈر سے دم چرائے پڑا رہا اور کروٹ تک نہ لی۔ جب صبح نے
گریبان چاک کیا اور امتہ نے آنکھ کھول کر دیکھا کہ کمبخت چور اس کی ساری چیز لوٹ کر لے گئے تو اُسے
رونا پیٹنا شروع کر دیا مگر ے

خیالِ زلف دوتا میں نصیر پیٹا کر ٭ گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

رونے دھونے سے کیا ہوتا تھا محلہ کے مرد اور عورتیں ہمدردی کے واسطے سید محمد کے مکان پر
اکٹھی ہوئیں اور تسلی و تشفی کی باتیں کرنے لگیں کوتوالی میں رپورٹ لکھی گئی اسی رنج اور پریشانی
میں دن کے تین بج گئے۔ یکایک امتہ کو خیال آیا کہ قاضی جی آج کے دن آنے کو کہہ گئے تھے یقین ہے
کہ شام تک آ جائیں گے۔ اور حمیدہ کو ساتھ لائیں گے۔ دن بھر اُسے واقعے گذرا تھا اور اب بھی اُسکا
کھانے پکانے کو جی نہ چاہتا تھا مگر اس خیال سے کہ حمیدہ آتے ہی کھانا مانگے گی وہ اُٹھی اور قند کو
میٹھے چاول پکانے لگی۔

امتہ۔ ابھی ذرا مدرسہ تو ہو آؤ۔ شاید حمیدہ آ گئی ہو۔

سید محمد۔ خوب یاد دلایا قاضی جی آج ہی کا وعدہ کر گئے ہیں میں ابھی جاتا ہوں۔ سید محمد
گھر سے باہر نکلا تھا جو عصر کی اذان ہوئی اور وہ سیدھا مسجد چلا گیا اور جماعت کیساتھ نماز میں
مشغول ہوا۔ سلام پھیر کر دیکھا تو پچھلی صف میں قاضی صاحب کو نماز پڑھتے پایا کیونکہ وہ تیسری
رکعت میں شامل ہوئے تھے جب نماز سے فارغ ہوئے تو سید محمد نے کہا کہئے حضرت خیر و عافیت
کے تشریف لائے۔

قاضی صاحب۔ خدا کا شکر ہے سب طرح خیریت سے ابھی ابھی آیا ہوں۔

سید محمد۔ حمیدہ کو گھر پہنچا دیا ہوگا آج اُس کی والدہ اسے یاد بھی بہت کر رہی تھیں۔

قاضی صاحب۔ میں گھر تو نہیں پہنچایا

سید محمد۔ تو کیا مدرسے میں بٹھا آئے ہیں۔

قاضی صاحب۔ مدرسہ میں بھی نہیں لایا

سید محمد۔ پھر کیا ابھی سواری میں ہی ہے

قاضی صاحب۔ [illegible]

سید محمد۔ پھر کہاں ہے

قاضی صاحب۔ احمد آباد چھوڑ آیا ہوں۔
سید محمد۔ سنگدل آپ تو اپنے آٹھ دن کے وعدہ پر لے گئے تھے یہ بدعہدی کیسی
اب میں اسکی ماں کو کیا جواب دونگا۔
قاضی صاحب۔ اسکی ماں کون ملا ہوتی ہے اور آپ کیا چیز ہیں لڑکی میری تھی
مجھے اختیار تھا چھوڑ آیا۔ سید محمد ایک نوجوان دوسرے مغلوب الغضب قاضی صاحب
کی اس خلاف تہذیب گفتگو کو سنکر وہ آگ بگولا ہوگیا اگر منشی ذاکر علی صاحب اور سردار علی
صاحب اور حاجی موذن اور محمد سعید صاحب امام اسے پکڑ نہ لیں تو وہ قاضی صاحب کی
خوب ذہن کشا کرتا مگر پھر بھی اپنے زبان سے بُرا کہنے میں کوئی منہ اوٹھا نہیں رکھا بارے
خدا خدا کرکے قاضی صاحب کو لوگوں نے مدرسہ بھیجا اور سید محمد کو گھر لائے جب امنہ کو یہ قصہ معلوم
ہوا تو وہ کھڑی اور پڑی پیٹنے لگی اور بیٹی کی جدائی میں اس نے رو رو کے اپنا بُرا حال کیا اور وہ
برابر یہی کہے جاتی تھی ہائے میں نے تو پہلے ہی کہا تھا لوگو! میری بچی کو نہ بھیجو یہ مُردہ قاضی
بڑا سنگدل اور بے شفقت ہے اسکے پاس حمیدہ پہونچ گئی تو تمام عمر بھر صورت نہ دکھائے گا مگر
میرا کہنا سمجھ میں نہ آیا کسی کا کیا گیا میں کمبخت اپنی آنکھ کی پتلی کو ساری عمر کے واسطے کھو بیٹھی۔
سید محمد کے باپ۔ محمد دلہن خدا کے لیئے تو اس طرح بلک بلک کر نہ رو میں ابھی
قاضی جی کے پاس جاکر انہیں قائل معقول کرتا ہوں اور تیری حمیدہ کو منگوائے دیتا ہوں اور
سید محمد کے والد مدرسہ گئے اور قاضی صاحب سے یوں گفتگو کرنے لگے کہ یہ کہاں کی شریعت
ہے کس مذہب و ملت میں روا ہے کہ ایک معصوم بچی کو اسکی ماں سے چھین کر پچاس کوس پر جا بٹھایئے۔
قاضی صاحب۔ میں سمجھا نہیں کس کا معصوم بچہ اور کس نے اسکی ماں سے چھین کر
پچاس کوس دور بھیج دیا
سید محمد کے باپ۔ آپ ابھی اس طرح کی لڑکی کو آٹھ دن کے وعدہ پر لے گئے تھے
اور اسے اپنے گھر چھوڑ آئے اور پھر آپ بنا کر پوچھتے ہیں کس کا بچہ اور کون لے گیا
قاضی صاحب۔ آپ قانون اور شرع سے بالکل ناواقف معلوم ہوتے ہیں بیاہی
لڑکی نہ کہئے۔ نکاح کہاں سے لڑکی لائی تھی مہر سے بیاہی لائی ہے بدلا میرا مرگیا

اب میں اُسکا منہ بھی دکھالوں وارث ہوں اسلئے میں نے اپنے پاس رکھ لیا کسی کو کیا۔
سید محمدؐ (کے نانا) آپ وارث ضرور ہیں مگر قانون اور شرع کا منشا یہی ہے کہ جب تک بچہ اسقدر چھوٹا ہے کہ بغیر کسی دوسرے آدمی کے وہ اپنی ضرورات طعام لباس کو خوبی پورا نکرسکتا ہو اپنی ماں کے پاس رکھا جائے اس واسطے آپکی یہ حرکت بالکل خلاف قانون کی ہے بہتر ہوگا کہ آپ لڑکی کو منگا دیجئے ورنہ نوبت بعدالت پہونچیگی۔ اور لڑکی آپ کو عدالت میں حاضر کرنی پڑے گی
قاضی صاحب۔ بہت خوب آپ عدالت کیجئے میں جواب دہی کرلونگا مگر لڑکی میں آپ کو نہیں دے سکتا ہوں ہر چند اور لوگوں نے بھی قاضی جی کو سمجھایا مگر وہ یہی کہتے رہے کہ لڑکی کا میں وارث ہوں اور وہ میرے ہی پاس رہیگی رفتہ رفتہ یہ قصہ سید محمدؐ کے نانا صاحب کے کان تک پہونچا اور یہہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ وہ رئیس کے استاد تھے اور رئیس صاحب انکا بزرگانہ ادب کرتے تھے اُنہوں نے قاضی صاحب سے تنہائی میں بہت نرمی کے ساتھ کہا کہ آپ کے واسطے یہی مناسب ہے کہ حمیدہ کو احمد آباد سے بلاکر اُس کی ماں کے پاس بھیج دیجئے ورنہ خدانخواستہ رئیس صاحب نے سُن لیا تو وہ بڑے برہم ہوجائیں گے اور لڑکی آپ سے منگا چھوڑینگے کیونکہ وہ نہایت رحمدل اور انصاف پرور ہیں کسی کا ظلم اور بیداد وہ ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے ہیں اور روزگار آپ کا ناحق جاتا رہیگا میر صاحب کا یہ فقرہ قاضی صاحب پر کارگر ہوا اور وہ بات کو سمجھ کر حمیدہ کو لانے کی غرض سے احمد آباد چلے گئے۔

انیسواں باب

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

امتہ بدنصیب دنیا میں مصیبت اور غم کے ہی واسطے پیدا ہوئی تھی اگلی تکلیفوں اور رنجوں کو کے دن گذرے تھے جو چوری اور ننھی سی بچی کے جیتے جی چھوٹ جانے کا پہاڑ

اسکے سر پر ٹوٹ پڑا اور پھر اسکی رات دن آہ و زاری میں گزرنے لگی۔ ہرچند اس کو گھر کنبہ کے عورت مرد سمجھاتے تھے کہ بیوی صبر کرو جان کی ملا مال خدا تجھے اور دے گا اور سرے نانا جان سے قاضی جی نے حمیدہ کو لا دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ وہ ایک دن میں تیری لڑکی تیرے پاس آئی جاتی ہے مگر اسکے کلیجہ میں وہ آگ اور آنکھ میں وہ دریا بھرا ہوا تھا جو حضرت یعقوب کے جگر اور نظر میں حضرت یوسف کی جدائی نے آتش کدہ اور سمندر رکھ دیئے تھے اسکی آہ آسمان کی خبر لاتی تھی اور اس کے آنسو ریگستان کو سیراب کرتے تھے اور چونکہ سات مہینے کا اسے حمل تھا اور فاقوں اور روحانی انقباض کا اثر جنین پر پڑتا تھا۔ اس لیئے اسکی زندگی نزع کی تلخی کا مزہ اسے چکھاتی تھی تاہم اسنے اٹھارہ انیس برس کی عورت تھی اور اسکو دلاسا دینے والے اسکے عزیز بھی بہت سے اس کے پاس تھے وائے برحال حمیدہ۔ کہ جس کی عمر کچھ دن کم چار برس کی اور اجنبیوں کے پاس تھی جن کی صورت اس نے اپنے ہوش میں نہ دیکھی تھی مکان غیر شکلیں غیر آوازیں غیر بستر غیر برتن غیر بول چال غیر احمد آباد اسکے واسطے حضرت یوسف کا اندھا کنواں تھا جس میں پڑی مرتی تھی۔ اور روتی تھی۔ اور اسکا کچھ بس نہ تھا اور غالبًا اسی بے گناہ کی بیقراری کا اثر تھا جو قاضی صاحب کے دل میں رحم پیدا ہوا اور اسے لئے احمد آباد گئے۔ اور چل تجھے نواب گنج پہونچا دوں تیری ماں تیرے بغیر بہت بے چین ہے اور پیچھے اسے لے کر نواب گنج پہونچے اور سید محمد سے کہا لیجئے یہ لڑکی تو میں لے آیا مگر صاحب یہ یاد رہے اگر میں شیخ زادہ اور قاضی ہوں تو لڑکی آپ سے لے چھوڑوں گا۔ رحیم صاحب سے کہہ کر یوں۔ انگریزی عدالت سے لوں۔ فی الوقت تحمل کیے رہتے ہوں۔ مگر ان کا ضرور ارادہ ہے کہ حمیدہ اسکے پاس رہے یہ نا ممکن ہے اور میری آبرو ہے [illegible] جیسی انہیں بیاہے شہر میں کروائی ہے وہ اچھا ہے [illegible] بھی خوش [illegible] کے پاس پہونچ گئی اور ماں [illegible] حل کر [illegible] مگر [illegible] دشمنی کی آگ [illegible] کی بھڑکی اور وہ [illegible] پھر آگ [illegible] کھلم کھلا ان کو دل جلائے۔ چنانچہ جل کر انہوں نے [illegible]

سکے واسطے آیہ کریمہ کا جلالی وظیفہ شروع کر دیا اور ایک عرضی سید محمد اور اُسکے خاندان کی شکایت اور حمیدہ کے حق واپس کی بابت رئیس صاحب کی خدمت میں گزرانی مگر فروری کا مہینہ تھا۔ اور رئیس صاحب مسر شہر علی گڈھ جاتے تھے اسلیے اُنہوں نے قاضی جی کی عرضی اپنے بکس میں رکھ لی اور قاضی صاحب سے کہدیا میں آکر جواب دونگا رئیس صاحب کے مہر کٹھ جانے کے دوسرے دن ۱۵ فروری ۱۹۰۶ء کو قاضی جی نے سنا کہ سید محمد کے پیر و مرشد علیگڈھ آئے ہیں اور سید محمد اور ان کے نانا صاحب اور ماموں صاحب اور سردار علی اور شیر محمد خان صاحب اور محمد سعید اور ناصر علی وغیرہ انکو سلام اور پابوس کے لیئے علیگڈھ جا رہے ہیں اور ان سب کو حضرت صاحب موصوف سے بیعت اور بے انتہا عقیدت ہے۔ اگر حضرت صاحب سید محمد سے کہدینگے کہ حمیدہ قاضی صاحب کے حوالے کر دو تو سید محمد کو کچھ بن نہ پڑے گی اور حمیدہ مجھے بے وقت ہاتھ لگ جائیگی چلو حضرت کی خدمت میں اپنا استغاثہ دائر کر دو اور جتنی سختی سید محمد کی سختیاں ان کے روبرو ظاہر کرو یہ خیال کر کے قاضی صاحب بھی سید محمد کے پیچھے پیچھے چلدیئے تاکہ علیگڈھ چل کر ساتھ پہونچ جائیں نواب گنج اسٹیشن جہاں سے علیگڈھ کو جاتے ہیں قصبہ سے پانچ میل ہے اسواسطے سید محمد وغیرہ یکہ اور گھوڑا گاڑی میں گئے مگر قاضی صاحب اسی دیوانگی میں پانچ میل پیدل دوڑے چلے گئے اوروں نے انٹر کلاس کے ٹکٹ لیئے مگر قاضی صاحب نے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور انٹر میں سوار ہوئے سید محمد کے چھوٹے ماموں بھی سب کے ساتھ علیگڈھ جا رہے تھے اور قاضی صاحب انہیں کے کمرے میں بیٹھے تھے اسلیئے ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ قاضی صاحب تھرڈ کا ٹکٹ لے انٹر میں آبیٹھے ہیں۔ اتفاقاً قاضی صاحب نے خواجہ حافظ صاحب کا یہ شعر پڑھا ؂

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

سید محمد کے ماموں نے کہا اس وقت تو یہ شعر اس طرح پڑھنا چاہیئے ؂

[illegible] چوں بسوئے علیگڈھ می کنند + تھرڈ را از خجل خود بے شبہ انٹر می کنند

چور کی داڑھی میں تنکا قاضی صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اوڑ گئے اور سمجھے کہ میری
یہ حرکت رکیک ان کو معلوم ہے اگر انہوں نے گارڈ سے کہدیا تو پکڑا جاؤنگا اس لئے
سید محمدؐ کے ماموں سے کہا خدا کے واسطے احسان فرمائیے کسی نے سن لیا تو غضب ہو جائیگا
آپ آل رسول ہیں۔ آپ کا کام عیب پوشی ہے سید محمدؐ کے ماموں مسکرا کر چپ ہو گئے
مگر قاضی صاحب حدک علیگڈھ پہونچکر ریل سے نہ اُترے لئے ڈرتے رہے۔ ان سب کی حضرت
صاحب کی خدمت میں باریابی ہوئی اور چونکہ حضرت صاحب وسیع الاخلاق اور
با خدا معتبر ہیں اس لئے قاضی صاحب کے ساتھ بہت التفات کے ساتھ پیش آئے
مگر قاضی صاحب کا حوصلہ نہ ہوا کہ وہ سید محمدؐ اور اُس کے نانا ماموں اور سردار علی
وغیرہ کے سامنے سید محمدؐ کی شکایت کرتے مگر جب یہ سب صاحب دوسری ٹرین
میں نواب گنج کو اس سب سے واپس چلے کہ رئیس صاحب موجود نہ تھے اور
لے اجازت آگئے تھے۔ سب کو قاضی صاحب نے میدان خالی دیکھ کر تنہائی میں
اپنا مدعا حضرت صاحب کی خدمت میں عرض کیا حضرت صاحب ایک جہاں دیدہ
اور مرد کامل ظاہری علوم سے بھی ماہر تھے اس لئے ایسے مغز سخن کو پہونچکر بہت نرمی
سے قاضی صاحب کو جواب دیا کہ آپ کی سراسر نا انصافی ہے کہ پونے چار برس کی
بچی کو بے ضرورت اُس کی ماں سے جدا کرنا چاہتے ہیں اور اپنے ساتھ مجھے
بھی اُسکے مظلمہ میں پکڑوانا چاہتے ہیں خدا سے ڈریئے اور اس خیال کو دل سے
دور کیجئے جب قاضی صاحب کو یہاں سے بھی مایوسی ہوئی تو ناچار نواب گنج چلے
آئے اور رئیس صاحب کے آنے کا انتظار کرنے لگے جب رئیس صاحب بلند شہر کو
نواب گنج واپس تشریف لائے پیشی کے محرر نے قاضی صاحب کی عرضی بکس میں سے نکالکر
رئیس صاحب کے ملاحظہ میں گذرانی رئیس صاحب نے اُس کو پڑھا تو یہ مضمون لکھا تھا۔

عرضی

ہمیشہ درگہ والا جناب احسان ست جو کعبہ مقصد حاجات اہل عالم باد

جناب عالی التماس ہے از افاضل غربا ور لائق ترا حم حاکمانہ ہے کیونکہ میں ایک غریب
بیکس پردیسی لاچار سوائے اللہ پاک قادر توانا نہ کوئی یار ہے نہ مددگار با ایں ہمہ بیکسی
اور لاچاری اور بے بسی ظالموں کا ہجوم اور ناخدا ترسوں کا میری جان پر نرغہ ہے
بوجہ مجھے ستاتے ہیں اور بے موجب خواہان میری آزردگی کے ہو رہے ہیں۔ خورشید میرا
چھوٹا بھائی جس کو میں نے ہی مثل اولاد کے پرورش اور تعلیم و تربیت کیا اور میں نے ہی
اسکی شادی کی میری اولاد زندہ نہیں رہی وہ جوان العمر فوت ہو گیا۔ اسنے ایک دختر
چھوٹی بہن میاں علی کی زوجہ ہے باوجودیکہ ان سب کے بھائی بھی ہیں اور یہ سب
صاحب اولاد بھی ہیں اور آئندہ اور اولاد ہونے کی بھی امید قوی اور حصول اولاد
کے اسباب اور ساماں بھی مہیا اور موجود اور میرے نہ اور بھائی ہے نہ کچھ اولاد
اور نہ آئندہ کو اولاد ہونے کی امید مجھ سے چاہتے ہیں کہ میں اس لڑکی کو چھوڑ
بیٹھوں جس شریعت پاک نے اس بیوہ کو نکاح ثانی کی اجازت دی اسی شرع
شریف نے پہلے شوہر کی اولاد سے دست بردار ہو جانے کا حکم دیا ہے میں نے مولوی
صاحب قبلہ اور علاوہ مولوی صاحب کے اور کئی علماء سے خوب صراحت کے ساتھ
دریافت کر لیا ہے آپ بھی مولوی صاحب سے اس کی تصدیق کامل طور پر فرمالیں۔ اور
لڑکی بفرط جوش خون مجھ سے اور اپنی پھوپھیوں سے از حد مانوس اور مالوف ہے اور
اپنی ماں سے جس روز سے نکاح ہو کر یہاں آئی ہے سخت متنفر ہو گئی ہے ماں ظالم اور
اس کا نیا شوہر جابرانہ برتاؤ سے اس الفت اور نفرت قانون قدرت کو متغیر کرنا
چاہتے ہیں اور اسی بات کی کوشش کر رہے ہیں بتحقیقات سے حضور پر یہ امر مخفی نہیں
رہ سکتا۔ بلکہ حضور نے بھی بچشم خود دس پانچ مرتبہ لڑکی کو میری گودی میں قلعہ کے اندر
لاتے اور قلعہ سے باہر لیجاتے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ آج پندرہ روز ہوئے کہ سید محمد
نے مجھے سخت سست کہا اور لڑکی کو ڈانٹا اور میرے پاس اس کو آنے سے بند کر دیا
لہذا امیدوار دادرسی اور حق یابی آپ کی حضور میں اس معاملہ کو پیش کر کے امیدوار ہوں
کہ واسطے اللہ پاک اور رسول صاحب لولاک کے مجھے اس فرقہ بے تمیزی اور اس

یتیم معصوم مظلوم کو اس مادر بے رحم کی رہائی اور اسکے شوہر سنگدل کے پنجۂ جبر و ستم
سے نجات دلوائے اللہ پاک فلاح اور بہبودی دارین سے حضور کو کامیاب اور
اولاد سعید اور فرزند رشید سے کامراں اور مقصد یاب فرمائے۔ آمین۔

عرضے

کمترین عقیدت آگیں حضور کا دعا گو
انوار حسین مدرس مدرسہ اسلامیہ
ریاست نواب گنج ۱۳ فروری ۱۹۰۹ء

رئیس صاحب ماشاء اللہ فہیم اور دانا اور رحم خدا ترسی اُنکے مزاج میں حد سے زیادہ
عرضی پڑھ کر اُنہیں خیال ہوا کہ اصلیت کیا ہے اور قصور کس کا ہے مگر یہ چھپا نہیں
رہا آخر تحقیق سے اچھی طرح کھل گیا کہ قاضی صاحب کی زیادتی ہے اور وہ بچہ اس
قابل نہیں ہے کہ اپنی ماں سے جدا کیا جائے اس لئے حکم دیا کہ عرضی داخل دفتر
اور مدعی سے کہدیا جائے کہ آئندہ ایسی لغو عرضی ہمارے روبرو پیش کی تو ہماری سخت ناخوشی
کا باعث ہوگا جب قاضی جی کو رئیس صاحب کی سرکار سے بھی خشک جواب ملا تو انہیں طیش
آیا اور امتہ کی بربادی کیواسطے انہوں نے ایک ٹانگ سے کھڑے ہو کر وظیفہ پڑھنا شروع کیا کیونکہ
ان کو یقین تھا کہ امتہ کے مرنے کے بعد آسانی سے حمیدہ کو لے سکتے ہیں۔

بیسواں باب

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

قاضی صاحب کو وظیفہ پڑھتے دو مہینے سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ امتہ پورے دنوں

فوٹ۔ ہمنے قاضی صاحب کی اصل عرضی رئیس صاحب کے دفتر سے نکلوا کر اسکی نقل یہاں درج کی ہے۔ ناظرین اسکو
مصنوعی عرضی یا مؤلف کی عبارت ہرگز نہ سمجھیں بلکہ نقل عرضی میں یہاں تک احتیاط سے کام لیا گیا ہے کہ
انشاء املا کی کسی غلطی کو بھی صحیح نہیں کیا ہے اور ہو بہو لکھدیا ہے۔

بیٹھی ہے اس کی ساس نندیں زچہ خانہ کی تیاریاں کر رہی ہیں گھر میں خوشیاں ہو رہی ہیں یہاں تک کہ اپریل سنہ ۱۹۰۶ء ۸ تاریخ آگئی اور امتہ کو درد زہ شروع ہو گیا دائی بلائی ہوئی آگئی مگر وہ امتہ کے ڈیل ڈول کو دیکھ کر دنگ ہو گئی اور اُسنے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔

سید محمود (کی خالہ) کیوں بی خیر تو ہے دائی اماں تم نے ایسا ٹھنڈا سانس کیوں بھرا۔

دائی (جھجکتے ہوئے) بیگم صاحب خدا آپ کی بہو کی جان کی خیر کرے اور اپنے پلنگ کو لات مار کر اُٹھے مجھے تو اس کے پیٹ میں تین بچے معلوم ہوتے ہیں میں سینکڑوں عورتیں جنا ڈالیں مگر اتنا بڑا پیٹ میں نے کسی عورت کا نہیں دیکھا۔ اس کے ہاں حمیدہ پہلے ہو چکی تھی یہ دوسرا حمل تھا اس لئے قرینہ یہ کہتا تھا کہ پہر دو پہر میں وہ فارغ ہو جائیگی مگر اسکے خلاف دوسرا دن ہو گیا اور بچہ کسی عنوان نہ ہوا اور درد و کرب بڑھنا شروع ہو گیا معمولی تعویذ گنڈے بھی باندھے گئے جو عورتوں کو مجربات معلوم تھے وہ بھی کئے گئے بیوی مریم کا پنجہ بھی پانی میں ڈالا گیا جو حکیم نے بتایا وہ بھی آزمایا گیا مگر بچہ نہ ہونا تھا نہ ہوا اب سب کو تشویش ہوئی اور یہ رائے قرار پائی کہ علیگڈہ سے لیڈی ڈاکٹرس بلائی جائے ہندوستانی جاہل دائی کا کام نہیں رہا سید محمد کے چھوٹے نانا علیگڈہ جانے کے واسطے تیار ہی تھے کہ یکایک ایک لڑکی پیدا ہوئی اور انکا جانا اور لیڈی ڈاکٹرس کا لانا ملتوی ہو گیا اور سب خوشیاں منانے لگے مگر دائی تجربہ کار تھی اُسنے کہا ابھی زچہ کے پیٹ میں دو بچے اور ہیں جب تک وہ دونوں پیدا نہ ہولیں خوشی کا موقعہ نہیں ہے فی الواقع ایک لڑکی کے ہو لینے سے امتہ کی طبیعت ٹھیر نے کے بدلے اور بگڑ گئی اور اب چونکہ ایک بچے کے نکل جانے سے پیٹ میں کسی قدر گنجائش ہو گئی تھی اس لئے پیٹ کے اندر وہ بچے جدا جدا معلوم ہونے لگے۔ اور دائی کے کہنے کی سب کو تصدیق ہو گئی اور یہ امید امید میں کہ جس طرح ایک لڑکی پیدا ہو گئی ہے اسی طرح دو بچے اور بھی پیدا ہو جائینگے مگر استغفر اللہ خدا کے حکم سامنے دائی اور حکیم کی ایک نہ چلی اور امتہ کی حالت بگڑنے لگی سانس اُلٹا چلنے لگا زبان لڑکھڑانے لگی ہاتھ پاؤں کا سکت جاتا رہا اب پھر لیڈی ڈاکٹرس کے لانے کے واسطے ایک آدمی علیگڈہ دوڑایا گیا مگر بیچاری امتہ کی حالت

دم بدم متغیر ہوتی تھی اور کسی سے کچھ بس نہ پڑتی تھی۔

امتہ (سید محمدؐ کی خالہ سے) خالہ جان آپ سب صاحب میرا کہا سنا معاف کریں اور میرے کلمہ کی گواہ رہیں میں اب خدا کے ہاں جاتی ہوں۔

خالہ۔ (بی بوا ایسی گھبراتی کیوں ہو دو چار گھنٹہ کی سختی ہے اللہ چاہے تو اب فارغ ہوئیں۔

امتہ (کراہ کر) اے بی خالہ جان آپ کا کہہ خیال ہے اب میں نہیں بچ سکتی اچھی ذرا میری حمیدہ کو تو بلواؤ میں اس کی صورت دیکھ لوں۔

خالہ۔ اچھا بی میں تمہاری لڑکی کو ابھی لاتی ہوں یہ کہکر سید محمدؐ کی خالہ کمرہ سے نکل کر باہر انگنائی میں آئیں کہ حمیدہ کو گود میں اٹھاکر اسکی ماں کے پاس لے جاؤں مگر حمیدہ نہ ملی سمجھیں کہ دوسری حویلی میں ہوگی مگر وہاں بھی نہ ملی تو انہوں نے یہ خیال کیا کہ باہر مردانہ میں اپنے باپ کے پاس ہوگی وہاں ڈھونڈ وایا تو وہ وہاں بھی نہ پائی اب فکر ہوئی کہ کہاں چلی گئی بچے اور بڑے سب حمیدہ کو ڈھونڈنے نکل کھڑے ہوئے مگر اسکا کہیں پتہ بھی نہ ملا زیادہ جلدی یہ تھی کہ امتہ کا سانس اُلٹا چل رہا تھا اور وہ بار بار یہ کہتی تھی کہ اچھی حمیدہ کو لاؤ مگر حمیدہ کو لاتے کہاں سے اسکو تو تقدیر نے خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچا دیا تھا سلطان الدین جو سید محمدؐ کا رشتہ کا ماموں ہوتا تھا وہ بھی حمیدہ کو جا بجا تلاش پڑے کرتے پھرتے تھے ناگاہ اُن کو میرزا احمد بیگ مل گئے۔

سلطان الدین۔ میرزا صاحب السلام علیکم۔

میرزا احمد بیگ صاحب۔ وعلیکم السلام۔ خیر تو ہے۔ اس وقت آپ مجھے کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں۔

سلطان الدین۔ آپ کا قیاس بہت درست ہے میں اس وقت بہت مشوش ہوں سید محمدؐ کی بیوی نزع کے عالم میں ہے اور لڑکی اسکی کھوئی گئی ہے اور وہ بار بار یہ کہتی ہے میری لڑکی کو میرے پاس جلدی لاؤ اب اگر اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ لڑکی لائی گیا کہاں سے وہ تو کھوئی گئی تو مرتے وقت اس کے کلیجہ میں ایسا چرکہ اور نہ پہنچے گا

اور اب تک یہ ٹھیک ٹھیک معلوم ہوا نہیں کہ لڑکی کھوئی گئی ہے۔ یا کہیں سو رہی ہے
یا کسی کھائی خندق میں جا پڑی ہے سارا ڈوابہ چھان لیا گیا ہے مگر پتہ نہیں
احمد بیگ۔ کوئی دو گھنٹے ہوئے جب میں نے عید گاہ پر سے دیکھا تھا قاضی انوار
حسین کا بھانجہ ایک لڑکی کو کندھے پر چڑھائے اترولی کی سڑک پر لیکا چلا جاتا تھا
میرے نزدیک یہ وہی لڑکی ہے جس کی آپ کو تلاش ہے۔
سلطان الدین۔ بے شبہ حمیدہ ہی تھی جس کو آپ نے منور علی کے کندھے پر جاتے
دیکھا ہے۔ کیونکہ قاضی صاحب مدت سے اس فکر میں تھے کہ لڑکی کسی طرح اُن کے قبضے
میں آجائے اب جو انہوں نے دیکھا کہ سب اُسکے علاج معالجہ میں مشغول اور بدحواس
ہو رہے ہیں موقع پا کر اُسے اپنے پاس بلا لیا اور احمد آباد بھیج دیا۔ سلطان الدین
اُلٹے پاؤں گھر آئے اور سید محمد اور اُس کے والد سے یہ قصہ کہا اور اس کے ساتھ
ہی لیاقت حسین ناصر حمید عبدالقوی عبدالولی ناصر منیر جنید لڑکوں سے جو قاضی جی
کے مدرسے میں پڑھتے تھے بیان کیا کہ قاضی صاحب نے ہمارے سامنے حمیدہ کو
منور علی کے ہمراہ اپنے گھر کو روانہ کیا ہے اور منور علی سے کہہ دیا ہے کہ اترولی تک
تو پیدل چلے جانا اور اترولی سے یکہ میں سوار ہو جانا دو چار روز میں میں بھی احمد آباد
آؤنگا۔ جب یکی سچی خبر مل گئی اور یقین ہو گیا کہ قاضی صاحب نے حمیدہ کو احمد آباد
بھیج دیا تو سلطان الدین اس بے رحمی کی رپورٹ کرنے رئیس صاحب کے پاس گئے۔
دن کے دس بجے تھے اور رئیس صاحب کچہری کر رہے تھے سلطان الدین جھککر آداب
بجا لائے اور رئیس صاحب کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔
رئیس صاحب۔ سلطان الدین کیوں آئے ہو تمھیں کچھ ہم سے کہنا ہے۔
سلطان الدین۔ جی ہاں حضور کی خدمت میں مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔
رئیس صاحب۔ کہو کیا کہنا ہے۔
سلطان الدین۔ حضور کو روشن ہے کہ قاضی انوار حسین صاحب مدت سے یہ
چاہتے کہ حمیدہ کو وہ اپنے پاس رکھیں مگر چونکہ لڑکی چھوٹی ہے اور اپنی ماں سے مانوس ہے

اور حضور کا حکم بھی یہی تھا کہ اپنی ماں کے پاس رہے چنانچہ لڑکی اپنی ماں کے پاس رہتی تھی مگر آج جو قاضی صاحب نے سنا کہ اُس کی ماں قریب المرگ ہے۔ اور میرا ہم اور سارا کنبہ اُس کی تیمار داری میں لگا ہوا ہے تو قاضی صاحب نے کچھ مٹھائی دیکر ایک شاگرد کو سید محمد کے گھر بھیجا اور یہ کہدیا کہ حمیدہ کو مٹھائی دینا اور اُسے بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے آنا حضور وہ لڑکی بچہ تو تھی ہی مٹھائی کے لالچ سے لڑکے کے ساتھ مدرسہ میں چلی آئی قاضی صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ منور علی اپنے بھانجے کے ساتھ اُسے اپنے وطن کو بھیجدیا اب جو حضور اُس کی ماں نے کہا میرا دم واپسیں ہے مجھے حمیدہ کی صورت دکھادو تو اُس کی تلاش ہوئی اور یہ معلوم ہوا جو حضور میں عرض کیا گیا صرف قلق اس کا ہے کہ مرنے والی ماں آخری وقت میں اپنی اکلوتی اور ننھی سی بیٹی کی شکل کو ترستی ہوئی دنیا سے جاتی ہے رئیس صاحب اوّل تو انصاف میں اپنے وقت کے نوشیرواں دوسرے اس کی خاص مہربانی میر صاحب کے خاندان پر سلطان الدین کا یہ بیان سنکر آگ ہی تو ہو گئے سامنے ایک نوجوان اردلی کھڑا تھا اُس سے کہا جمعدار کو بلاؤ جمعدار حاضر ہوئے۔

رئیس صاحب۔ جمعدار۔

جمعدار۔ غریب پرور۔

رئیس صاحب۔ قاضی انوار حسین کو فوراً بلاؤ۔

جمعدار۔ ابھی حاضر کرتا ہوں۔ جمعدار فوراً مدرسہ گئے اور قاضی صاحب کو اپنے ساتھ لائے اور رئیس صاحب کے سامنے کچہری میں حاضر کیا۔

رئیس صاحب۔ ہم نے سُنا ہے قاضی صاحب آپ نے چپکے سے حمیدہ کو احمد آباد بھیجدیا ہے یہ بات سچ ہے یا غلط؟

قاضی صاحب۔ (بہت دیر میں سوچ کر) درکار یہی سچ ہے۔

رئیس صاحب۔ جب ہم نے آپ کو منع کر دیا تھا کہ لڑکی آپ سید محمد سے نہ طلب کریں اور اُسکی ماں کے پاس رہنے دیں پھر کیا۔ جو ہے جو آپنے اُسکے خلاف کیا۔

قاضی جی۔ ہم سے قصور ہوا۔
رئیس صاحب۔ آپ سے صرف ایک قصور نہیں ہوا بلکہ تین قصور ہوئے ایک یہ کہ
میرے حکم کے خلاف کیا دوسرے دھوکے سے لڑکی کو بلا کر اُسے بھگا دیا تیسرے یہ کہ
اُسکی ماں کو مرتے وقت بیٹی کی جدائی کا صدمہ پہونچایا آپنی بیرحمی ایسا ظلم معاذ اللہ کوئی کافر
بھی نہ کرے گا۔ خیر اب یہ بتایئے کہ لڑکی کو روانہ کئے کتنی دیر ہوئی۔
قاضی صاحب۔ حضور چار گھنٹے۔
رئیس صاحب۔ کس طرف اُسے بھیجا ہے اور لیجانے والے سے کیا کہہ دیا ہے۔
قاضی صاحب۔ اترولی کی طرف بھیجا ہے اور یہ کہہ دیا ہے کہ اترولی سے یکہ یا دوپہیے
میں بٹھا کر اسے سیدھے شہر احمد آباد لے جانا۔
رئیس صاحب۔ آپنے سخت نازیبا حرکت کی ہے آپکی سفید ڈاڑھی کا لحاظ ہے ورنہ
اس سیاہ قلبی کی آپ کو وہ سزا دیتا کہ آپ تمام عمر یاد رکھتے اچھا کوئی ہے۔
اردلی۔ حاضر۔
رئیس صاحب۔ مرداں سنگھ سوار کو بلاؤ
بہادر سنگھ۔ حضور میں حاضر ہوں
رئیس صاحب۔ مرداں سنگھ دیکھو زین کسنے میں دیر ہوتی ہے تم ہمارے
سوار ہونے کے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر دوڑا کر اترولی کو جاؤ اگر اترولی کی سڑک پر منور علی اور
لڑکی پا جانا تو دونوں کو لیکر پلٹ آؤ ورنہ جہانگیر آباد کی سڑک پر جانا اور دس کوس پانچ
کوس پر جہاں لڑکی ملے وہاں سے اُسے مع اُس بدمعاش کے لیکر آنا مگر دیکھو دیر نہ کرنا سرپٹ
جانا سرپٹ جانا اور سرپٹ آنا۔ بہادر سنگھ بہت اچھا کہہ کے روانہ ہوا اور رئیس صاحب
نے حکم دیا دیکھو نبی اللہ دو نئے صاحب جب تک لڑکی واپس نہ آئے قاضی جی نظر بند رہیں
اور پھر حکم دیا کہ امیر سنگھ دوسرا سوار گھوڑے پر زین کس کر با اطمینان اترولی کو روانہ
ہو اگر لڑکی مل جائے تو اسکو بہادر سنگھ سے لیکر پالکی میں آرام سے بٹھا کر لے آئے اُسکے
اور امیر سنگھ منور علی کو پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ ساتھ لائے دوسرا سوار بھی چند منٹ میں

حمیدہ کی تلاش کے واسطے اتروالی کو تیر رواں ہوا اور کچہری برخاست ہوئی۔

سلطان الدین حضور میں آداب عرض کرتا ہوں۔

رئیس صاحب۔ ہاں تم جاؤ اور میر صاحب کو ہماری طرف سے سلام کہو اور پیام دو کہ ہم نے دو سوار لڑکی کی تلاش میں بھیجے ہیں اور بہت تاکید کر دی ہے کہ جلدی لڑکی کو لے کر پھریں مگر خدا کرے جب تک لڑکی آئے جاں بلب مریضہ جیتی رہے۔

اکیسواں باب

ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کہیں جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

مئی کی دسویں تاریخ جمعرات کا دن ہے اور بس اب ایک صحرائے لق و دق ہے جہاں تک نظر جاتی ہے سوائے جنگل اور اُجاڑ کے کچھ دکھائی نہیں دیتا ہے خاک اُڑ رہی ہے بگولے زمین سے اُٹھ اُٹھ کر آسمان تک جا رہا ہے ربیع کے کھیت جو کٹ گئے ہیں اور اُن کی باریک اور زرد رنگ جڑیں جو رہیں برائی رہ گئی ہیں وہ گویا کسی عاشق تشنہ لب کی زبان کے کانٹے ہیں جو موت کی پیاس سے پیدا ہو گئے ہیں سفید اور نیلا آسمان جو زمین سے لگا ہوا نظر آ رہا ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مردہ دشمن کے جنازہ کی چادر ہے جو گہوارہ پر ڈال رکھ دی ہے۔ ہوائیں مارہ سکتے ہیں زمین تپ رہی ہے لوئیں چل رہی ہیں بھیڑیے گیدڑ زبان نکالے ہوئے ہانپ کے مارے تڑپتے تڑپتے پھرتے ہیں اور اگر کسی گڑھے میں ذرا سی کیچڑ مل جاتی تھی تو وہیں لوٹنے لگتے ہیں پرندوں کی چونچیں بھی گرمی کی وجہ سے کھل رہی ہیں اور درختوں پر بیٹھے ہانپ رہے ہیں سامنے پکی سڑک ہے جو زلف محبوب کی طرح ادھر سے اُدھر تک ایسی دراز ہی دم نار کرتی ہوئی چلی گئی ہے اور اُس کی لمبائی کوسوں تک نہ پہنچا معلوم ہوتی ہے۔ اسی سڑک پر ایک نوجوان سفید پوش مسلمان صد دشت پورب کی طرف سے لپکا ہوا پچھم کو جا رہا ہے اور اُس کے کندھے پر ایک لڑکی سوار ہے اور لڑکی کے دونوں ہاتھ اس نوجوان کے ہاتھ میں ہیں

اس شخص کا حال جو دھوپ اور گرمی سے ہو رہا ہے وہ ہو رہا ہے مگر لڑکی پر سخت مصیبت ہے آفتاب کی حرارت سے اُس کی جسد یا جلی جاتی ہے منہ لال ہو گیا ہے سر سے پاؤں تک پسینہ میں نہا رہی ہے چیخیں مار مار کر روتی ہے اور کہتی ہے ہائے میں نہیں جانتی ہائے مجھے کہاں لے آئے ہائے پیاس ہائے گرمی ہائے میں جلی ہائے میں مری اچھی مری اماں تم کہاں ہو اچھی خدا کے لئے بچاؤ ہائے مجھے مارے ڈالتے ہیں مگر سنسان اور بیابان جنگل میں کون ہے جو اُس کی فریاد کو پہونچے نوجوان نے ہمت تو بہت کی اور وہ اس گرمی میں کئی کوس لپکا چلا گیا آخر پاؤں تھک گئے پیاس نے بے چین کر دیا لون نے بولا دیا اور اُسے ایک پیپل کے درخت کے نیچے جو سڑک سے کوئی دس قدم کے فاصلے پر تھا آرام لیا اور لڑکی کو زمین پر بٹھا دیا گرم ہوا کی لپیٹ زمین کی تپش پیپل کے پتوں کی بھیانک آواز یہ اُس غریب بچی کو سہمائے دیتے تھے اور اُس کا کلیجہ ڈر کے مارے بیٹھا جاتا تھا اور وہ بے تحاشا چیخ رہی تھی۔

نوجوان کیوں ری حمیدہ کیوں ری کتیا تو چپ نہ ہوگی۔ لون تیری خبر کہتے کہتے تھک گیا ہوں کہ چپ ہو چپ ہو مگر باز ہی نہیں آتی۔ ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ نوجوان میاں منور علی صاحب ہیں اور لڑکی وہی حمیدہ ہے جس سے آپ خوب واقف ہیں معصوم بچی جو اپنی ماں کی یاد میں پاگل ہو رہی تھی وہ نوجوان کی دھمکی کو کیا خاطر میں لاتی تھی منع کرنے سے اور روئی اور نوجوان غصہ کے مارے آپے سے باہر ہو گیا اُٹھا اور سامنے سے ایک بیبا پالنے کی قمچی توڑ لایا اور لڑکی کو سرخچی سے مارنا شروع کیا ہر قمچی پر کہتا تھا کیوں اب بھی روئے گی کیوں اب بھی اماں جان کو یاد کرے گی کیوں اب بھی پانی مانگے گی نوجوان نے اپنی خوب مار مار کر اُس بے گناہ کے مارنے میں پورا صرف کر دینا چاہا اور غالباً وہ اُسے جان سے نہ مارتا تو ادھموا ضرور کر دیتا مگر اُسنے دیکھا کہ پورب کی جانب سے ایک گرد اُٹھتی چلی آتی ہے اور اس گرد کو دیکھ کر خدا جانے کیا اُسے خیال پیدا ہوا۔ کہ اپنا ہاتھ اُسنے روک لیا اور اُدھر مخاطب ہو گیا جب گرد کم ہو کر پاس آ گئی تو معلوم ہوا بہادر سوار ایک گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار چلا آتا ہے۔ الہڑ سے گھوڑے کی تیزی اور

چالاکی چال سے پہلے اور رن سے آگے قدم رکھتی ہے نوجوان سوار کو دیکھ سٹ پٹایا اور اُسنے چاہا کہ بھاگ جائے مگر سوار بلا کی طرح سر پر آگیا تھا اُسنے للکار کر کہا او پاجی منور علی ٹھہر جا کہاں جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک انٹر اُس کی پیٹھ پر رسید کیا اللہ بہت پھرتی سے اُتر کر اپنے سر کے دوپٹے سے منور علی کے ہاتھ کس کر باندھ لیئے اور حمیدہ کو گود میں اُٹھالیا اور پیار کیا اور کہا بوا گھبراتی ہیں تیری اماں اچھی ہیں اور میں ابھی تیری اماں جان کے پاس پہونچائے دیتا ہوں۔ ہائے محبت کی نظر چھپی نہیں رہتی حمیدہ کو بہادر سنگھ کے کہنے سے تسلی ہوگئی اور وہ خاموش اور خوش ہوگئی۔ اب بہادر سنگھ نے اُسے پیڑ میں بٹھا دیا۔ اور گھوڑے کو پیپل کے درخت کے نیچے ٹہلانے لگا کیونکہ سات میل گرمی میں سرپٹ آئے تھے اور پسینہ میں سر سے پاؤں تک ڈوب رہے تھے بہادر سنگھ بہت خوش تھا کہ میں نے چور پکڑ لیا مگر اُسے یہ فکر تھی کہ نواب گنج سات میل ہے ننگی پیٹھ پر لڑکی کو کیونکر بٹھاؤں گا اور گھوڑا کیونکر دوڑاؤنگا اور گھوڑے کے ساتھ منور علی کیونکر چلیگا اور اگر منور علی کو چھوڑ دونگا تو رئیس صاحب کو کیا جواب دونگا ناگاہ امیر سنگھ سوار بھی اس موقع پر پہونچگیا اور بہادر سنگھ نے امیر سنگھ کے ساتھ لڑکی کو نواب گنج روانہ کر دیا اور منور علی کو ساتھ لیے آہستہ آہستہ وہاں سے چلا۔ دو گھنٹے نہ پائے تھے جو بہادر سنگھ حمیدہ کو لیکر نواب گنج پہونچگیا امتہ بستر موت پر لیٹی ہوئی ہچکیاں لے رہی تھی نبض ڈوب رہا تھا ناک اور کان کی نوکیں ٹھنڈی ہو گئی تھیں شہد اور آب زمزم کا شربت حلق میں چوایا جا رہا تھا جو حمیدہ اُس کی بیٹی پاس جا پہونچی۔

سید محمدؒ (کی خالہ جان) لے لو بی حمیدہ آگئیں۔

امتہ (توتلی زبان سے) الحمد للہ بیٹی کہاں چلی گئی تھیں بڑی دیر لگائی حمیدہ نے تو اس کا کچھ جواب نہ دیا مگر سید محمدؒ کی خالہ نے کہا اپنے بڑے ابا کے پاس چلی گئیں تھیں۔

امتہ۔ کیوں نہیں گھٹنے مڑیں گے تو پیٹ کو ہی مڑیں گے۔ اب تو یہ ساری عمر بڑے ابا کے ہی پاس رہیگی ذرا اس کو میرے پاس تو لاؤ۔ سید محمدؒ کی خالہ نے حمیدہ کو امتہ کے پلنگ پر بٹھا دیا امتہ نے آنکھ کھول کر دیکھا اور اُسے پیار کیا اور کہا لو بیٹی اللہ علی

تمہیں بطور امانت خدا کو سونپا۔ سید محمدؐ کی خالہ نے حمیدہ کو پلنگ پر سے اُٹھا لیا اور امتہ نے پھر کلمہ پڑھنا شروع کیا اور ابھی شاید دو تین مرتبہ اُسنے کلمہ پڑھا ہوگا جو اُس کے مرغ روح نے جنت الفردوس کو پرواز کی اور ساری تکلیفوں اور ساری مصیبتوں کا ہمیشہ کے واسطے خاتمہ ہو گیا۔

کیا اعتبار دہر کا عبرت کی جا ہے یہ
عشرت سرا کبھی کبھی ماتم سرا ہے یہ

جب اُس کو دفن کر چکے تو علیگڈھ سے لیڈی ڈاکٹر مس نواب گنج پہونچیں اور ان کو اپنے بعد از وقت پہونچنے کا بہت قلق ہوا فیس بھی نہیں لیتی تھیں مگر زبردستی پچیس روپیہ اُن کو دے کر رخصت کیا۔ رئیس صاحب کو جب معلوم ہوا کہ قاضی صاحب نے مرحوم کے مرنے کے واسطے ایک تانگہ سے کھڑے ہو کر وظیفہ پڑھا ہے۔ تو اُن کو بہت نفرت پیدا ہوگئی اور اُن کو برخاست کر کے نواب گنج سے نکلوا دیا۔ حمیدہ ان کے ساتھ بھیجی گئی اور پھر اُس کا حال ہم کو کبھی نہیں معلوم ہوا۔ مگر ہم اُس شہید نار کی تربت پر جا کر ہر جمعرات کو فاتحہ پڑھ دیتے ہیں کیونکہ مَنْ مَاتَ مِنَ النَّفْسِ فَقَدْ مَاتَ شہیداً۔

تمام شد

مخزن ادبی کے علمی جواہرات

ازواج الانبیاء کسی مسلمان کا گھر اس بابرکت کتاب سے خالی نہیں رہنا چاہئے قیمت عہ

پیاری دنیا مشہور ظرافت نگار سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ کا لطف ظرافت کے پیرایہ میں لکھا ہوا قابل قدر ناول قیمت ۱۲؍

مقالات خلافت مؤلفہ شیخ عبد القادر بی اے بیرسٹر ایٹ لا قیمت ۱۲؍

مثنویات میر حسن مثنوی بے نظیر و بدر منیر کے ساتھ مثنوی گلزار ارم ایک قلمی نسخہ سے نقل کر کے شامل کر دی گئی ہے۔ قیمت عہ

طوفان حیات علامہ راشد الخیری کی بے مثل تصنیف قیمت عہ

سینٹ نیٹ انگریزی کتاب ووارنس کا بامحاورہ ترجمہ تبت کے متعلق معلومات کا ذخیرہ قیمت ۸؍

الانسان علم الانسان میں بے نظیر کتاب مصنفہ مولوی سجاد مرزا بیگ صاحب دہلوی قیمت عہ

النحل شہد کی مکھیوں کے تاریخی حالات اور پرورش کے متعلق دلچسپ کتاب مصنفہ سید رحمت حسین صاحب بی اے ایل ایل بی قیمت (۱۰؍)

نیلی چھتری ایک دلکش ناول قیمت (۱۲؍)

رسالہ تذکیر و تانیث اردو زبان کے محقق حضرت جلال مرحوم لکھنوی کی قابل قدر تحقیق ہے۔ قیمت (۱؍) علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ

مخزن بک ایجنسی لاہور